قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اٹھہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

جنوری 2021ء

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے





علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٢

تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو (1:5) وہ ہمارے اس ضابطۂ قوانین کے اندر محفوظ ہے (15:9) جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے، اور نہ کوئی نفسیاتی اُلجھن۔ یہ ضابطۂ قوانین، سفرِ زندگی میں، اُن لوگوں کو انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں۔

(سورۃ البقرہ: 2، مفہوم القرآن از پرویز)

طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

جنوری 2021ء

جلد 74 | شمارہ نمبر 1

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا۔۔۔؟	ادارہ	4
طلوعِ اسلام سیمینار (29 نومبر 2020ء)	رپورتاژ	6
معافی قانون کی رُو سے	پرویزؒ	8
کرو موسومز کا ذکر قرآن مجید کے حوالہ سے	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	22
توبہ کا قرآنی مفہوم	خواجہ ازہر عباس	31
ملائکہ کا اللہ کے تدبیر امور سرانجام دینے کی قوت کا تصور	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	36
ن س خ	لغات القرآن	51
بچوں کا صفحہ: اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے	ادارہ	56

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Tolu-e-Islam Seminar 2020	58
Surah Al-Najm (النجم) – Durus-al-Qur'an: Chapter 2 By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)	60

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: ٠٤٦٥٠٠4073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد قرار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر وبیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂؐ بدر وحنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نم ناک می گردد
ببازارِ محبت نقد ما کامل عیار آمد
سر خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملت ما سازگار آمد
''بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم وطرحِ دیگر اندازیم''

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا۔۔۔؟

1۔ قرآنی معاشرہ میں ہر شخص کی عزت بلاتمیز قوم، رنگ، نسل، پیشہ، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص اپنے فرائض کی بجا آوری میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے اور نوع انسان کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے۔

2۔ کوئی شخص بے کس ولاچار اور بے یار و مددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی، اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔ کوئی صاحب اثر انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا۔

3۔ کوئی فرد بھوکا ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہو گا۔ یعنی قرآنی معاشرہ ہر شخص کی اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔

4۔ معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا انتظام کرے جس سے انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ بالفاظ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

5۔ ہر شخص اپنی پوری استعداد و محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کریں گے، جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں، یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جائیں اور باقی لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

6۔ ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی اپنے دل کی رضامندی سے حاجت مندوں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھے گا بلکہ عندالضرورت دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے گا۔ ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔

7۔ رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ افراد معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ جب افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجت مندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

8۔ ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق (اس معاشرہ میں گروہوں، لیڈروں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا۔) اس لئے اس میں نہ کسی قسم کا جور ہوگا نہ استبداد، نہ ظلم ہوگا نہ

زیادتی۔ اسے نظام خداوندی یا قرآنی نظام معاشرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

9۔ ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ ہوگا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

10۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوگا کہ ہر شخص قوانین خداوندی کے محکم اور مکافات عمل کے برحق ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ نظام قائم ہی ان بنیادوں پر ہوگا۔ اس میں قرآن کریم کی مستقل اقدار عملاً نافذ ہوں گی۔

تحریک طلوع اسلام' پاکستان میں اس قسم کے نظام کی تشکیل کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ نوع انسان کی مشکلات اور مصیبتوں کا حل اسی قسم کے نظام کے قیام میں مضمر ہے تو اس کے قیام و عمل کے لئے اپنا فریضہ ادا کیجئے اور ہم سے تعاون فرماتے ہوئے ادارہ یا قریبی بزم سے رابطہ کیجئے۔

چیئرمین ادارہ آپ سے اپیل کرتا ہے کہ اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں اور ان کو بروئے کار لانے میں اپنے آپ کو آمادہ پاتے ہیں اور مدد کرنا چاہتے ہیں تو اپنے مختصر کوائف قریبی بزم یا ادارہ کو بھجوا دیں۔ آپ حضرات بحدِ استطاعت ان مقاصد کی معاونت کر سکتے ہیں لیکن آپ پر ادارہ کے قواعد وضوابط کی پابندی اور وابستگی لازمی نہیں ہوگی۔

محترم خریداران مجلّہ طلوعِ اسلام

خصوصی توجہ فرمائیں

قارئین کرام اور جن کھاتہ داران نے مجلّہ طلوعِ اسلام جاری کروایا ہوا ہے ان سے گزارش ہے کہ آپ اپنی فہرست خریداران 15 جنوری 2021ء تک ادارہ طلوعِ اسلام کو بھجوا دیں اور جن کو میگزین سال 2021ء کے لئے جاری رکھنا مقصود ہو یا جن کے میگزین بند کرنے ہوں، مکمل فہرست، ایڈریس کے ساتھ بھجوا دیں تا کہ بروقت عمل درآمد ہو سکے۔ شمارہ کی اشاعت میں اضافہ آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اگر بیرونِ ملک یا اندرونِ ملک کی بزم میں مزید تعاون کریں تو اس تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے اُمید ہے کہ قارئینِ طلوعِ اسلام اس مسئلہ پر تعاون کریں گے۔

التماس ہے کہ قارئینِ کرام اپنے کھاتوں میں معقول رقم جمع کرانے کا اہتمام کریں تا کہ واجب الادا رقوم کی وجہ سے ادارہ مالی پریشانیوں کا شکار نہ ہو۔

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

رپورتاژ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوعِ اسلام سیمینار
(29 نومبر 2020ء)

جیسا کہ آپ سب احباب کو معلوم ہے کہ ادارہ طلوعِ اسلام طویل عرصہ سے ہر سال کنونشن اور سیمینار کے انعقاد کا اہتمام کرتا چلا آ رہا ہے امسال یعنی کنونشن 2020ء عالمی وباء COVID-19 کی وجہ سے منعقد کرنا ممکن نہیں تھا۔ سو پروفیسر ڈاکٹر صالحہ نغمی صاحبہ کی ایک تجویز پر طلوعِ اسلام سیمینار 2020ء آن لائن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے Zoom ایپ کو منتخب کیا گیا کہ اُس پر بیک وقت بہت سے افراد شریکِ مجلس ہو سکتے ہیں۔

محترم ڈاکٹر اعجاز رسول صاحب نمائندہ طلوعِ اسلام بزم لنڈن، یوکے نے اس آن لائن سیمینار کے انتظام وانصرام کا ذمہ لیا۔ اس ضمن میں تمام احباب کو آن لائن سیمینار کے تقاضوں کے مطابق ہدایت نامہ جاری کیا گیا اور قرآنی اقدار کے موضوعات پر دعوتِ اظہار کے لئے مراسلت کی گئی جسے قبول کرتے ہوئے درجِ ذیل محترم مقررین اپنی پریزنٹیشن دینے کے لئے آمادہ ہو گئے:

1۔ نبیلہ حارث، کراچی، موضوع: (تربیتِ اطفال) Parenting

2۔ محترم ممتاز خان (کینیڈا)، موضوع: متشابہات۔ قرآن کی روشنی میں

3۔ محترم محمد اقبال (کراچی)، موضوع: Man-made system versus the Divine system

4۔ ڈاکٹر حامد میاں (نیویارک) موضوع: Manifestation of a developed human self

چیئرمین ادارہ محترم خورشید انور صاحب نے مقالۂ افتتاحیہ پیش کرتے ہوئے ''نظامِ ربوبیت'' کے قیام کی اہمیت پر زور دیا تاکہ انسانیت کی ناؤ مشکلات ومصائب کے بھنور سے نکالی جا سکے۔ نوعِ انسانی آج اپنے مسائل کے حل کے لئے کسی ایسے ہی نظام کی طرف منتظرانہ دیکھ رہی ہے۔ طلوعِ اسلام ایک تحریک کے طور پر پرویز صاحب کی تحریرات کی روشنی میں قرآنِ کریم کو عقل وفکر سے سمجھ کر، دُنیا کو متعارف کرانے کا عزم رکھتی ہے۔ چیئرمین ادارہ نے مختصراً بتایا کہ ادارہ نے اس ضمن میں جو اقدامات اُٹھائے ہیں ان میں ادارہ طلوعِ اسلام کی ویب سائٹ ''www.toluislam.org'' کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

نیز یوٹیوب چینل (www.youtube.com/idaratolueislamofficial)، فیس بک پیج (www.facebook.com/TalueIslam)، انسٹاگرام (www.instagram.com/idaratolueislam)، ٹوئٹر (www.twitter.com/IdaraTolu) کو تشکیل دینے کے بعد ان سب کو ویب سائٹ سے بھی منسلک کر دیا گیا ہے تا کہ ان سب ذرائع کی مدد سے ادارہ کے لٹریچر، تقاریر و تحاریر کو فکرِ قرآنی کی پیاسی دنیا تک پہنچایا جا سکے جس سے نوعِ انسانی اپنی مشکلات کے حل کی طرف گامزن ہو سکے۔

محترمہ نبیلہ حارث صاحبہ (دُختر آصف جلیل صاحب) نے پرورشِ اولاد کے موضوع کو ماڈرن علمِ نفسیات اور قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کی روشنی میں زیرِ بحث لے آئیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے ہاں بدقسمتی سے والدین کے لئے اس ضمن میں کوئی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہی نہیں کیا جاتا۔ انہوں نے بہت سے نکات بیان کئے جو والدین کے لئے پرورشِ اطفال میں بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

محترم ممتاز خان صاحب نے ''متشابہات'' کے موضوع کو قرآنِ کریم کی آیت 3:7 کی روشنی میں بیان کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ اللہ کے قول (کلام اللہ) اور فعل (کائنات) میں کوئی تضاد ممکن نہیں ہے۔ جوں جوں انسانی علم ترقی کرتا جائے گا قرآنِ کریم میں مندرج آیاتِ متشابہات کے اسرار و رموز بھی عیاں ہو کر قرآنِ کریم کی حقانیت کو ثابت کرتے چلے جائیں گے۔ انہوں نے علمِ فلکیات اور قرآن کے تناظر میں بہت سے دلچسپ و حیرت فزا نکات بیان کئے۔

محترم محمد اقبال نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام، کراچی ڈیفنس نے انسانوں کے بنائے ہوئے اور اللہ کے قرآن میں دیے ہوئے نظام ہائے معاشرت و معیشت کا دلچسپ تقابل پیش کیا اور دین اور مذہب کے فرق کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا۔ جس سے نتیجہ اخذ کیا کہ انسان ساختہ نظاموں سے انسان نے ہمیشہ ہی نقصان و خسارہ اُٹھایا ہے۔ مصائب سے نکلنے کے لئے دنیا کو قرآن کی طرف آنا ہوگا۔

ڈاکٹر حامد میاں نے دُنیا کو مثبت سمت میں تبدیلی لانے کے لئے انسانی ذات کے ارتقاء کو لازم قرار دیتے ہوئے بہت سی قرآنی آیات کے حوالے دیے۔ اُنہوں نے بتایا کہ دین کا نظام نافذ کئے بنا دُنیا و عاقبت کی بھلائی ممکن نہیں ہے۔ قرآنی اقدار ہی انسانی ذات کے ارتقاء و نشوونما کا ماحول مہیا کر سکتی ہیں جس کے نتیجے میں یہ دُنیا جنت نظیر ہو جائے گی۔

سیمینار میں اکنافِ عالم کے مختلف ملکوں و شہروں کے کم از کم 44 احبابِ قرآنی نے شرکت کی۔ اس سیمینار کی میزبانی محترم ڈاکٹر اعجاز رسول نے بہت خوش اسلوبی اور خوب صورتی سے سرانجام دی۔ سیمینار میں پیش کی گئی پریزنٹیشنز (Presentations) کی ریکارڈنگ ادارہ طلوعِ اسلام کے وٹس ایپ گروپس، یوٹیوب چینل، ویب سائٹ، فیس بک پیج، انسٹاگرام، ٹوئٹر وغیرہ میں شیئر کر دی گئی ہیں جہاں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معافی قانون کی رُو سے

یہ مضمون غلام احمد پرویز صاحب کے ایک مقالہ ''مشینی انسان اور قرآنی نظام'' سے محترم اعجاز رسول صاحب نے اخذ اور تجویز کیا ہے۔ پرویز صاحب کا مذکورہ بالا مقالہ جولائی 1981ء کے ماہنامہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔ اُمید ہے قارئین کرام کو پسند آئے گا۔
(مدیر)

اب آپ قرآنی قوانین کو دیکھئے۔ ان میں سزا اور عفو دونوں یکجا موجود ہیں۔ یعنی سزا سے معافی نہ تو کسی خارجی اتھارٹی کی طرف سے ملتی ہے اور نہ ہی وہ مجرم کو رحم کے طور پر عطا ہوتی ہے۔ یہ خود قانون کا جزو ہوتی ہے اور جو مجرم ان شرائط کو پورا کرتا ہے (یعنی تاب و اصلح کی شرائط کو) وہ از روئے قانون اس کا حقدار ہو جاتا ہے۔ اس باب میں ہم معمولی لغزشوں سے شروع کر کے سنگین جرائم تک پہنچیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم کی رُو سے کوئی بھی جرم ایسا نہیں جس میں معافی کی گنجائش نہ ہو۔ یعنی جس میں ارتکابِ جرم کے بعد خدا کے ''غفور رحیم'' ہونے کا ذکر نہ ہو۔

1۔ عام اُصول:

سورۃ النساء میں ہے:

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ (4:110)

جس شخص نے کوئی ایسا کام کیا جس کا تخریبی اثر معاشرہ پر پڑتا ہو، یا خود اس کی اپنی ذات پر، اور پھر وہ اس کے لئے خدا سے حفاظت طلب کرے، تو اس نقصان کی تلافی بھی ہو جائے گی اور اس کی ذات کی نشوونما کا سامان بھی مہیا ہو جائے گا۔

اس اصولی تذکرہ میں ہر قسم کا جرم آ جاتا ہے، خواہ وہ معاشرہ کے خلاف ہو یا انسان کی اپنی ذات کے خلاف۔ سورۃ النمل میں قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں فرمایا کہ اس شخص کو ڈرنے کی ضرورت نہیں:

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱﴾ (27:11)

جو کوئی زیادتی کر بیٹھے لیکن اس کے بعد حسن کارانہ انداز سے (قانون اور قاعدے کے مطابق) اس کا ازالہ کرے، تو وہ خدا کی طرف سے مغفرت اور رحمت سے نوازا جائے گا۔

سورۃ الاعراف میں ہے:

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾ (7:153)

جن لوگوں سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے لیکن اس کے بعد وہ اس سے تائب ہو جائیں اور قانونِ خداوندی کی صداقت پر یقین کر لیں، تو وہ خدا کو غفور و رحیم پائیں گے۔

اس آیۂ جلیلہ میں، تَابُوْا کے بعد اٰمَنُوْٓا، بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے، تو اس وقت درحقیقت، اس قانون کی محکمیت اور مکافاتِ عمل پر اس کا ایمان نہیں ہوتا۔ اگر اسے اس کا یقین ہو تو اس سے ارتکابِ جرم سرزد ہی نہ ہو۔ معاشرہ سے جرائم کے انسداد، یا کم از کم اصلاح کے لئے یہ بڑا مؤثر طریق ہے۔ یعنی افرادِ معاشرہ کے دل میں قانون کے احترام اور اس کی خلاف ورزی کے نقصانات پر علیٰ وجہ البصیرت یقین (ایمان) کو پختہ سے پختہ تر کیا جائے۔ اور یہ عمل مسلسل اور متواتر جاری رہے۔ یہ مقصد قانون کی پابندی کے خوشگوار نتائج کو محسوس شکل میں سامنے لانے سے حاصل ہوگا۔

سورۃ الاحزاب میں اس اصولِ مغفرت (معافی) کو ہمہ گیر بتایا گیا ہے، فرمایا:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ (39:53)

(اے رسول ﷺ!) میرے ان بندوں سے، جو اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہوں، کہہ دے کہ وہ خدا کی رحمت سے نا اُمید نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمام لغزشوں کے نقصانات کی تلافی کا انتظام کر دے گا۔ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔

اس کا طریق یہ ہے کہ:

وہ فوراً قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کریں اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں، قبل اس کے کہ سزا ان پر وارد ہو جائے۔ اس صورت میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔

خدا کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ:

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ (39:55)

جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے (یعنی قرآنِ کریم) اس کا بطریقِ احسن اتباع کرو، قبل اس کے کہ تم اپنے دل

میں مطمئن ہو رہو کہ مجھ سے کوئی مواخذہ کر سکتا ہے، اور خدا کا قانون تمہاری گرفت کر لے۔

(ضمناً) آیت (39:53) میں ''اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ ۔۔۔'' کہا گیا ہے۔ یعنی مجرم یہ سمجھتا ہے کہ اس نے دوسرے شخص کو نقصان پہنچایا ہے، حال آن کہ اس ارتکابِ جرم سے خود اس کی ذات کو نقصان پہنچا ہے۔ فریقِ مقابل کو تو کوئی طبیعی نقصان پہنچا ہوگا۔ اس سے خود اس کی ذات کو جو نقصان پہنچا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا، یہ جرم کسی اور کے خلاف نہیں، خود اس کے اپنے خلاف سرزد ہوا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے: وَمَنۡ یَّکۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا یَکۡسِبُہٗ عَلٰی نَفۡسِہٖ ؕ (4:111) ''جو شخص بھی کوئی جرم کرتا ہے، تو وہ جرم کسی دوسرے کے خلاف نہیں، خود اس کے اپنے خلاف ہوتا ہے۔'' اس حقیقت کو اگر افرادِ معاشرہ کے دل میں جاگزیں کر دیا جائے، تو معاشرہ سے جرائم معدوم ہو جائیں۔ اسلام کے صدرِ اوّل کے متعلق جو حقیقت بیان کی جاتی ہے کہ اس میں جرائم معدوم ہو گئے تھے تو اس کی وجہ انتظامیہ (پولیس وغیرہ) کی حسن کارکردگی نہیں تھی۔ اس کی وجہ، افرادِ معاشرہ کی صحیح تعلیم و تربیت سے ان کی ذہنیت کی تبدیلی تھی۔ قانون کی صداقت پر ان کا یقین محکم تھا۔ اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، معاشرہ میں اصلاح ہو ہی نہیں سکتی، (13:11)۔ ڈنڈے کے زور سے، جرائم کا انسداد تو ہو نہیں سکتا۔ اس سے البتہ، انسان، حیوانوں کی سطح پر آ جاتے ہیں۔

توبہ کا مفہوم

2۔ تو بلا تاخیر:

سورۃ الزمر کی آیات (55-39:54) میں جو کہا گیا ہے کہ توبہ، سزا سے پہلے ہونی چاہئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ارتکابِ جرم کے بعد، خود مجرم کے خلاف دل میں جذباتِ نفرت کا بیدار ہونا۔ اس سے مجرم کا منفعل ہونا اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کا عزم کر لینا، اس کا نام توبہ ہے۔ سزا کی عقوبت سے بچنے کے لئے توبہ کو آڑ بنا لینا، توبہ نہیں، توبہ کے لئے دل کی تبدیلی لازمی شرط ہے۔ اس کا احساس ارتکابِ جرم کے فوری بعد ہونا چاہئے۔ سورۃ النساء میں ہے:

اِنَّمَا التَّوۡبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِیۡبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوۡبُ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۷﴾ (4:17)

توبہ اُن کی قابلِ قبول ہوگی جن سے محض نادانی (جہالت) سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے اور وہ اس سے بلا تاخیر تائب ہو جائیں۔ یہ ہے خدا کا وہ قانون جو علم اور حکمت پر مبنی ہے۔

ان کے برعکس:

وَ لَیۡسَتِ التَّوۡبَۃُ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَہُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّیۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَ لَا الَّذِیۡنَ یَمُوۡتُوۡنَ وَ ہُمۡ کُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۸﴾ (4:18)

ان کی توبہ، توبہ کہلا ہی نہیں سکتی جو ارتکابِ جرم کرتے رہیں اور جب موت سامنے آ کھڑی ہو تو کہہ دیں ''یا اللہ میری توبہ''

نہ ہی ان کی جو حالتِ کفر ہی میں وفات پا جائیں۔ یہ الم انگیز عذاب کے مستوجب ہوں گے۔

یہاں یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ آیت (7:153) میں سچی توبہ کو ''تجدیدِ ایمان'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جرم پر اصرار کو کفر سے۔

اس اصولی وضاحت کے بعد، جرائم کی طرف آیئے:

1۔ فواحش کی اشاعت:

بے حیائی کا ارتکاب تو ایک طرف، قرآنِ کریم کی رُو سے اس کی اشاعت بھی جرم ہے، ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۹﴾ (24:19)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ جماعتِ مومنین (اسلامی معاشرہ) میں بے حیائی کی باتیں عام کریں اُنہیں اس دنیا میں بھی الم انگیز سزا ملے گی اور آخرت میں بھی۔ تم نہیں جانتے کہ فواحش کی اشاعت سے بھی معاشرہ کو کس قدر نقصان پہنچ جاتا ہے۔

اللہ کو اس کا علم ہے۔ اس لئے اس نے اسے روکنے کے لئے تاکید کی ہے کہ ایسا پھر نہ کرنا (24:17) اس کے بعد ہے:

وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ وَاَنَّ اللّٰہَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۰﴾ (24:20)

جو کچھ تمہارے ہاں اس سلسلہ میں ہوا ہے، اگر اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو اس سے بڑا نقصان ہو سکتا تھا۔ یہ خدا کی رافت و رحمت ہے جو تمہیں ایسے نقصانات سے محفوظ رکھتی ہے۔

رقیق القلبی:

اس مقام پر خدا کی صفت رافت و رحمت کا خصوصیت سے ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایسے جرائم کا فیصلہ کرنے والے ''مشینی انسان'' نہیں ہونے چاہئیں۔ ان کے سینے میں نرم و نازک حساس قلوب ہونے چاہئیں۔

قلبِ گداز:

حضور ﷺ کو اس قسم کا قلبِ گداز عطا ہوا تھا جس کا خدا نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے:

فَبِمَا رَحۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنۡتَ لَہُمۡ ۚ وَلَوۡ کُنۡتَ فَظًّا غَلِیۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِکَ ۪ فَاعۡفُ عَنۡہُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ وَشَاوِرۡہُمۡ فِی الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَوَکِّلِیۡنَ ﴿۱۵۹﴾ (3:159)

(اے رسول ﷺ!) یہ تیرے خدا کی موہبتِ کبریٰ ہے کہ اس نے تمہیں قلبِ گداز عطا فرمایا ہے۔ اگر تم سنگدل اور سخت مزاج ہوتے، اور انسانی کمزوریوں کی رعایت کے لئے تمہارے دل میں نرم گوشہ نہ ہوتا، تو

تمہاری جماعت کے افراد ایک ایک کر کے تمہیں چھوڑ جاتے۔ لہٰذا تم (قانونِ خداوندی کے مطابق) ان کی کوتاہیوں سے درگذر کرو اور ان کے لئے حفاظت کا سامان طلب کرو۔ ان کی لغزشوں کی بنا پر انہیں دھتکارو نہیں بلکہ انہیں اپنے قریب رکھو اور معاملات میں ان سے مشورہ لیا کرو۔ (اس سے ان میں عزتِ نفس اور خود اعتمادی کا احساس اور بھی بڑھ جائے گا۔)

ایسے ہونے چاہئیں محافظانِ آئین اور نا قدانِ قوانینِ خداوندی! ان کا واسطہ انسانوں سے پڑنا ہے۔ حیوانوں یا پتھر کی چٹانوں سے نہیں! آپ نے غور فرمایا کہ ان سے مشاورت کا حکم دے کر، احترامِ آدمیت کا کتنا بڑا ثبوت دیا گیا ہے۔ اقبالؒ نے شاید ایسے ہی مقام کے لئے کہا تھا کہ ؎

نہ چھپا چھپا کے تو رکھ اسے، تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے، نگاہِ آئینہ ساز میں

اور یہ نتیجہ تھا سچی توبہ کا۔ (پھر اقبالؒ ہی کے الفاظ میں) ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے [1]

(عَرَقِ اِنفعال: شرمندہ ہونے پر آنے والا پسینہ)

2۔ ارتکابِ فواحش:

پہلے اشاعتِ فواحش کا ذکر تھا۔ اب اس کے ارتکاب کا جرم سامنے آتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۣ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (3:135)

مومنین کی خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ اگر ان سے کبھی (سہواً) فواحش کا ارتکاب ہو جائے، تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں، اور خدا سے اپنی لغزش کے نقصان کی حفاظت طلب کرتے ہیں۔ یہ سامانِ حفاظت قانونِ خداوندی کی رُو ہی سے مل سکتا ہے۔ وہ اپنی اس لغزش پر اصرار نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح خدا کی طرف سے حفاظت نہیں مل سکے گی۔

ہم نے پہلے۔۔۔ کہا ہے کہ قانونِ خدداوندی کی رُو سے مجرم کو جو معافی ملتی ہے تو یہ رحم (Mercy) کے طور پر، خیرات نہیں ہوتی۔ اس سے تو انسانیت کی تذلیل ہو جاتی ہے۔ وہ اسے قانونی گنجائش کے طور پر بطورِ استحقاق حاصل کرتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں: اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۔۔۔ (3:136) یہ ان کے حسنِ عمل کا بدلہ ہوتا ہے۔ یہ ان کے عرقِ انفعال کے موتیوں کی قیمت ہوتی ہے جو انہیں ادا کی جاتی ہے۔

---

(1) کس قدر سچ کہا ہے کسی نے کہ ؎

ہیرا بھی ہے دل تو پتھر ہے، یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے ہاں پانی ہو کر بہ نکلے، پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

آپ غور فرمائیے کہ قرآنِ کریم، کس طرح قدم قدم پر، اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لاتا ہے کہ انسان، اپنی کسی لغزش (جرم) کی وجہ سے احترامِ آدمیت سے محروم نہیں ہوجاتا۔ قرآنِ کریم میں ''آدم وابلیسؑ'' کا تمثیلی بیان، اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔ آدمؑ سے بھی لغزش ہوئی اور ابلیسؑ سے بھی۔ آدم سے پوچھا گیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا، تو اس نے جُھکے ہوئے سَر، شرم آلود نگاہوں سے کہا کہ: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۖ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ (7:23) ''اے ہمارے رب! ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم بھول گئے۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا، اگر تو ہمیں سامانِ مغفرت ورحمت عطا نہیں کرے گا تو ہم تباہ ہوجائیں گے۔'' ان کی توبہ قبول ہوگئی۔ ابلیسؑ سے پوچھا تو،۔۔۔ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (2:34) اس نے سرکشی اختیار کی۔ اکڑ کر سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس نے قانون کے احترام اور اطاعت سے انکار کر دیا تو وہ راندۂ درگاہ ہوگیا۔ یہ ہے اصل الاصول قرآنی معاشرہ میں نظامِ عدل کا۔

3۔ ایذا رسانی:

سورۃ البروج میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ﴿١٠﴾ (85:10)

جو لوگ، مومن مردوں اور عورتوں کو ایذا پہنچاتے ہیں، وہ اگر توبہ نہ کریں تو انہیں سوزناک عذاب دیا جائے گا۔

ایذا رسانی میں طبیعی ایذا اور نفسیاتی ایذا، دونوں شامل ہیں۔ یعنی تذلیل وتضحیک، جسے عرفِ عام میں ازالۂ حقیقتِ عرفی کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی معافی (توبہ) کی گنجائش موجود ہے۔

4۔ سرقہ

جرمِ سرقہ کی سزا کے متعلق ارشاد ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٨﴾ (5:38)

سارق مرد اور سارق عورت کے جرم کی سزا یہ ہے کہ ان کے ہاتھ قطع کر دیئے جائیں۔ یہ خدائے عزیز وحکیم کی طرف سے عائد کردہ روک تھام ہے۔

چونکہ زیرِ نظر موضوع کا تعلق صرف اس نکتہ سے ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے ہر جرم میں معافی کی گنجائش رکھی گئی ہے، اس لئے میں ''سرقہ'' کی تفصیل اور قطعِ ید کے مفہوم کی وضاحت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، اپنے آپ کو موضوع تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ مندرجہ بالا آیت سے ملحق اگلی آیت میں ہے:

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٩﴾ (5:39)

دیکھئے! اس میں ارتکابِ جرم (ظُلْمِہٖ) کے بعد تائب اور اَصْلَحَ ہونے کا کہا گیا ہے۔ سزا مل چکنے کے بعد نہیں۔ قطعِ ید کی سزا مل جانے کے بعد معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خدا کی غفور رحیمی، تو سزا سے معافی کا نام ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، یہ سزا بھی عادی مجرموں کے لئے ہے، جو نہ اپنے جرم پر نادم ہوں۔ نہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں۔ بلکہ۔۔۔ بار بار ارتکابِ جرم کریں۔ (3:134)

5۔ قذف (تہمت تراشی):

جرم قذف کی سزا اسّی کوڑے ہے (24:6) لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی مذکور ہے کہ:

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡا ۚ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (24:5)

(لیکن) جو لوگ ارتکابِ جرم کے بعد تائب ہوں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو وہ قانونِ خداوندی کی رُو سے معافی کے مستحق ہوں گے۔

6۔ مستورات سے چھیڑ چھاڑ:

قرآنِ کریم نے عفت مآب مستورات سے چھیڑ چھاڑ کو سنگین جرم قرار دیا ہے اور اس کی سخت ترین سزا مقرر کی ہے۔ ہجرتِ نبوی ﷺ کے بعد، مدینہ کی ابتدائی زندگی میں شر انگیز عناصر کی کثرت تھی۔ مسلمان خواتین باہر نکلتیں تو وہ لوگ ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔ پوچھنے پر کہہ دیتے کہ ہم نے سمجھا تھا کہ یہ بازاری عورتیں ہیں۔ ان کے اتمامِ حجت کے لئے، مسلمان عورتوں سے کہا گیا کہ وہ باہر نکلیں تو اپنے لباس کے اوپر ایک ''اوورآلِ'' سا اوڑھ لیا کریں تا کہ ان میں اور بازاری عورتوں میں تمیز ہو سکے۔ اس کے بعد فرمایا:

لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ وَّ الۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ لَنُغۡرِیَنَّکَ بِہِمۡ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوۡنَکَ فِیۡہَاۤ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۶۰﴾ مَّلۡعُوۡنِیۡنَ ۚ اَیۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا اُخِذُوۡا وَ قُتِّلُوۡا تَقۡتِیۡلًا ﴿۶۱﴾ (33:60-61)

(اگر اس کے باوجود) منافقین اور شر انگیز عناصر اور جھوٹی خبریں پھیلانے والے، اپنی خباثتوں سے باز نہ آئیں تو ان کے خلاف قوّت سے کام لینا پڑے گا۔ اس سے یہ لوگ (رفتہ رفتہ) یہاں سے خود ہی چلے جائیں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انہیں تمام حقوقِ شہریت سے محروم کر دیا جائے گا۔ اگر یہ اس پر بھی اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں تو جہاں کہیں بھی ہوں انہیں گرفتار کیا جائے اور شدت کے ساتھ قتل کیا جائے۔

غور کیجئے! ایسا سنگین جرم اور اس کی ایسی شدید سزا، لیکن اس کے لئے بھی کہا گیا کہ انہیں پہلے وارّن کیا جائے۔ اگر یہ اس پر بھی باز نہ آئیں، تو پھر سزا کے اقدامات کئے جائیں۔ مقصد تو معاشرہ میں قیامِ امن ہے۔ اگر یہ مقصد سزا کے بغیر حاصل ہو جائے تو ہو المراد۔ ایسا نہ ہو تو پھر دار و گیر کے لئے قدم اٹھایا جائے۔

7۔ جرمِ زنا:

قرآنِ کریم کی رُو سے جرمِ زنا کی سزا (عورت اور مرد دونوں کو) سو کوڑے ہے۔ (24:3) یہ چوبیسویں سورۃ ہے۔ اس سے اگلی (پچیسویں) سورۃ میں مومنین کی خصوصیات کے سلسلہ میں کہا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾

(25:68-69)

یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے اقتدار کے ساتھ کسی اور کا اقتدار تسلیم نہیں کرتے اور انسانی زندگی کو جسے خدا نے واجب الاحترام قرار دیا ہے، تلف نہیں کرتے۔ بجز اس کے کہ انہیں حق و انصاف کی خاطر ایسا کرنا پڑے۔ نہ ہی یہ لوگ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسا کرنا جرم ہے۔

ان جرائم کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے اور قیامت میں اس سے بھی زیادہ۔ یہ لوگ ذلّت و خواری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہے:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾ (25:70)

لیکن جو مجرم، تائب ہو جائے۔ قانون کے احترام کا سچے دل سے یقین کرے، صلاحیت بخش کام کرے، تو خدا کا قانون اس کی سابقہ غلط روش کے نتائج کو حسنات سے بدل دے گا۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔

اس میں جرمِ قتل اور جرمِ زنا، دونوں کو قابلِ معافی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اصولاً یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ (25:71)

(خدا کا قانون یہ ہے کہ) جو شخص بھی اپنی کسی غلط روش کو چھوڑ کر صلاحیت بخش کام کرتا ہے۔ اس کا ہر قدم قانونِ خداوندی کی طرف اٹھتا ہے۔ (اس کی زندگی اس کے مطابق ہو جاتی ہے)۔ یعنی سابقہ غلط روش کا کوئی داغ اس کے دامنِ زندگی پر باقی نہیں رہتا۔ اس کے سب دھبے دُھل جاتے ہیں۔

8۔ لواطت یا سحاقت:

سورۃ النساء میں ہے:

وَالّٰذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ (4:16)

اگر دو مرد (یا دو عورتیں) بے حیائی کے جرم کی مرتکب ہوں تو انہیں مناسب سزا دو۔

اس سے عام طور پر لواطت یا سحاقت دونوں جرم مراد لئے جاتے ہیں۔

جتنا حصہ اوپر درج کیا گیا ہے وہ اس آیت کا حصۂ اوّل ہے۔ بقایا آیت یوں ہے:

فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (4:16)

لیکن اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو کر اس سے باز آ جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو ان سے درگزر کرو۔ قانونِ خداوندی میں معافی کی گنجائش ہے جو باعثِ رحمت بن جاتی ہے۔

9۔ قتلِ ناحق:

قرآنِ کریم کی رُو سے قتلِ ناحق سنگین ترین جرم ہے۔ اگر وہ قتلِ عمد ہے تو اس کی سزا موت ہے۔ اگر قتلِ خطا ہے تو سزا' دیت (خوں بہا کی ادائیگی) ہے۔ (4:92-93) اوپر آیات (25:68-70) درج کی جا چکی ہیں۔ ان کی رُو سے جرمِ قتل میں بھی معافی کی گنجائش ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر سکتے ہیں یہ صحیح نہیں۔ مجرم کو معاف کر دینے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ جرم، قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ لہٰذا، اس کی عقوبت (سزا یا معافی) کا فیصلہ بھی قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوگا۔ معافی کی گنجائش خود قانونِ خداوندی میں رکھ دی گئی ہے۔ جسے مجرم ''تاب و اصلح'' کی شرائط پوری کرنے سے حاصل کر سکتا ہے۔ کسی کے عطا کرنے سے نہیں۔ حتیٰ کہ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) اس کا حق سربراہِ مملکت کو بھی حاصل نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اسی حق کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جرمِ قتل کو معاف کر دیا تھا۔ (28:16)۔ واضح رہے کہ یہ معاملہ خدا اور اس کے ایک نبی علیہ السلام کے درمیان تھا جس کے ساتھ خدا براہِ راست ہم کلام ہو جاتا ہے لہٰذا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جرم کو خدا نے براہِ راست معاف کر دیا۔ ہمارا اور خدا کا معاملہ اس کی کتاب (قوانین) کے ذریعے سے ہے، اس لئے ہمارے جرائم کا فیصلہ خدا کی کتاب (قانونِ خداوندی) کی رُو سے ہوگا جس کی قوتِ نافذہ قرآنی حکومت ہوتی ہے۔

10۔ بغاوت یا انارکی:

سورۂ مائدہ میں ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴿۳۳﴾ (5:33)

جو لوگ نظامِ خداوندی (قرآنی مملکت) کے خلاف بغاوت کریں۔ یا ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کریں تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔ یا انہیں جلاوطن (یا نظر بند) کر دیا جائے۔ یہ سزا ان کے لئے دنیا میں ذلت و رسوائی کا موجب ہوگی اور اُخروی زندگی میں اس سے بھی زیادہ سخت عذاب ہوگا۔

اس کے بعد ہے:

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡہِمۡ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ (5:34)

لیکن جو لوگ اس سے از خود باز آ جائیں (تائب ہو جائیں) قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پا لو (اور اس طرح وہ مغلوب ہو جائیں) تو تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے انہیں بھی معافی مل سکتی ہے۔

یہاں معافی ان کے لئے بتائی گئی ہے جو مغلوب ہونے سے پہلے ہتھیار رکھ دیں اور تاب کی شرط پوری کر دیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس صورت میں ان سے مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مغلوب ہونے کے بعد وہ شرمسار اور نگوں سار ہوں اور ان میں اصلاح کا امکان نظر آئے تو پھر بھی انہیں معاف کیا جا سکتا ہے یا انہیں بالضرور سزا دی جائے گی۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کا فیصلہ قرآنی حکومت پر چھوڑا گیا ہے کہ (جس طرح وہ قرآن میں تجویز کردہ سزاؤں میں سے، حسبِ موقعہ کوئی سی سزا بھی دے سکتی ہے، اسی طرح) وہ اگر مناسب سمجھے تو انہیں اصلاح کا موقع بھی دیا جا سکتا ہے۔ قریشِ مکہ نے نہ صرف قرآنی حکومت کے خلاف بغاوت کی بلکہ وہ چھ سات سال تک مسلسل ان کے خلاف لڑائیاں لڑتے رہے اور انہوں نے ہتھیار اس وقت رکھے جب مکہ فتح ہو گیا۔ اب وہ سب پابجولاں حضور ﷺ کے سامنے تھے۔ قرآن کی رُو سے آپ کو اختیار تھا کہ ان سزاؤں میں سے جو سزا مناسب سمجھتے، ان پر وارد کر دیتے۔ لیکن حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ: لا تثریب علیکم الیوم۔ ''جاؤ! تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔'' (یہ الفاظ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے مجرم بھائیوں سے کہے تھے۔ 12:92)۔ حضورؐ کے اس عفوِ کریمانہ کا نتیجہ وہ نکلا جس سے نہ صرف قریش، مدینہ اور حجاز کی بلکہ ساری دنیا کی تاریخ بدل گئی۔

اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ کسی جرم کی سزا تو قرآن کے خلاف نہیں دی جا سکتی لیکن عفو کی گنجائش بہرحال ہوتی ہے۔

◆◆◆◆

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، قانون کا نفاذ، مشینی ضوابط کے مطابق، آنکھ بند کر کے ہتھی گھما دینا نہیں۔ اس میں انسانی تقاضوں (Human Considerations) کو ملحوظ رکھنا مقدم ہوتا ہے۔ قانون کا مقصد فرد اور معاشرہ کی اصلاح ہے انتقام جوئی یا اذیت رسانی سے حصولِ لذت (Sadism) نہیں۔ اگر یہ مقصد، مجرم کو اصلاح کا موقعہ دینے سے حاصل ہو سکتا ہے، تو پھر اس سزا دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ سزا کی ضرورت اس وقت پیش آئے گی جب مجرم میں تبدیلی ذہنیت کا امکان نہ ہو، اور معاشرہ کو اس کی حیوانیت یا درندگی سے بچانا مقصود ہو۔ دیکھئے! خدائے غفور و رحیم نے اسے کتنے پیارے انداز میں بیان کیا ہے جب کہا کہ: مَا یَفۡعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمۡ اِنۡ شَکَرۡتُمۡ وَ اٰمَنۡتُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیۡمًا (4:147) ''اگر تم حق کو مانو اور قانون کے احترام کا دل سے یقین کرو، تو خدا نے تمہیں سزا دے کر کیا لینا ہے؟ وہ مستبد اور ظالم حکمران نہیں۔ وہ انسانی کمزوریوں سے واقف ہے اور حسنِ عمل کا قدردان ہے۔'' یہ ہے وہ ماٹو (Motto) جسے قرآنی مملکت کے اربابِ حل وعقد اور کارپردازانِ نظم ونسق کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔

اس کے لئے بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ خود قانون کے اندر، عفو وتخفیف کی گنجائش رکھی جائے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآنی قوانین میں تو (ہر جرم کے ضمن میں) اس کی گنجائش موجود ہے۔ انتظامیہ کے لئے جو قواعد وضوابط مرتب کئے جائیں، ان میں اتنی لچک اور وسعت رکھنی چاہئے کہ فیصلہ کرنے والا، انسانی تقاضوں کی رعایت رکھ کر، ان کے مطابق فیصلہ کر سکے۔

آپ کہیں گے کہ اگر ہر جرم کے لئے معافی کی گنجائش ہو، اور ہر انتظامی ضابطہ میں لچک اور وسعت ہو، تو اس سے بدعنوانی (Corruption) کے دروازے کھل جائیں گے۔

آپ کا اعتراض بجا ہے۔ موجودہ نظام اور معاشرہ میں، جہاں جرائم بھی ناقابلِ معافی ہیں، اور انتظامی قواعد وضوابط بھی بے لچک، اس قدر بدعنوانی ہے، تو اگر ان میں ایسی لچک اور گنجائش رکھ دی جائے تو اس سے یقیناً بدعنوانی کے پھاٹک کھل جائیں گے۔

سیرت وکردار:

لیکن ایسا کہتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جن قوانین وضوابط کا اُوپر سے ذکر چلا آرہا ہے۔ وہ قرآنی مملکت کے قوانین وضوابط ہیں۔ قرآنی نظام کے تحت ان کا نفاذ ہوگا اور ان کے نافذ کرنے والے قرآنی سیرت وکردار کے حامل ہوں گے۔ قرآنی نظام میں، ناجائز دولت تو ایک طرف، اپنی ضرورت سے زائد، جائز دولت رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔ اس میں نہ جائیدادیں کھڑی کی جاسکیں گے، نہ جاگیریں قائم کرنے کی گنجائش ہوگی۔ جہاں تک کارپردازانِ نظم ونسق کا تعلق ہے، ان کی کیا کیفیت ہوگی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں بیت المال سے ایک مزدور کی روزانہ اُجرت کے مطابق وظیفہ لیا۔ وفات کے وقت، باچشمِ پُرنم کہا کہ معلوم نہیں میں نے مسلمانوں کے بیت المال سے جتنا لیا ہے اس کے مطابق ان کی خدمت بھی کرسکا ہوں یا نہیں۔ بہتر ہو کہ اس حساب کو یہیں چکا دیا جائے۔ ایک چھوٹا سا قطعۂ زمین تھا۔ اسے بیچا اور جتنی رقم بنتی تھی اسے بیت المال میں جمع کرادیا۔

اس سیرت وکردار کے حامل ہوں گے وہ افراد جو ان قواعد وقوانین کو نافذ کریں گے!

قانون کے نفاذ میں یہ حضرات انسانی کمزوریوں اور معاشرتی مقتضیات کا کس قدر خیال رکھتے تھے، ہمارے صدرِ اوّل کی تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ ابن بلتعہؓ کے ملازموں نے کسی کی اونٹنی چرا کر، ذبح کر کے کھالی۔ جرم ثابت ہوجانے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سزا کا حکم سنادیا لیکن ایک ثانیہ کے توقف کے بغیر کہا کہ ذرا ٹھہرو۔ میں یہ معلوم کرلوں کہ انہوں نے اس جُرم کا ارتکاب کیوں کیا تھا!۔۔۔ دریافت کرنے پر مجرموں نے کہا کہ ہمارا مالک ہم سے کام تو پورا لیتا ہے لیکن کھانے کو اتنا کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے بھوک سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے۔ آپ نے مجرموں کو رہا کر دیا ابن بلتعہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا کہ اس دفعہ تو میں تمہیں صرف اتنی سزا دیتا ہوں کہ اونٹنی کے مالکوں کو اس کی قیمت ادا کردو۔ اگر آئندہ تم نے اپنے ملازموں کو بھوکا رکھا اور وہ اس قسم کے جرم کے ارتکاب پر مجبور ہوگئے تو اس جرم کی سزا تمہیں دی جائے گی۔

دارقطنی کی یہ روایت بھی ہمارے سامنے ہے کہ سرقہ کا ایک مجرم حضور نبی اکرم ﷺ کے سامنے لایا گیا لیکن آپ ﷺ

نے اسے معاف کر دیا۔ پھر دوسری مرتبہ اس نے چوری کی لیکن آپ ﷺ نے اسے پھر معاف کر دیا۔ اسی طرح تیسری مرتبہ اور چوتھی مرتبہ بھی۔ جب اس نے پانچویں مرتبہ چوری کی تو پھر آپ ﷺ نے سزا نافذ فرمائی۔۔۔ (کنز العمال)۔ روایت میں یہ تو نہیں بتایا گیا کہ اس بار بار معافی کی بنیاد اور وجہ کیا تھی، لیکن یہ تھا قرآن کے اس حکم کے عین مطابق کہ سزا صرف عادی مجرموں کو دی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق عام طور پر کچھ ایسا نقشہ سامنے آتا ہے کہ وہ بڑے سخت مزاج، کرخت اور درشت قسم کے انسان تھے۔ لیکن درحقیقت وہ ایسے نہیں تھے۔ وہ اپنے سینے میں کس قدر گداز قلب رکھتے تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ ایک دفعہ انہوں نے کسی شخص کو گورنری کے لئے منتخب کیا۔ اس کی تعیناتی کا پروانہ لکھا رہے تھے کہ ایک بچہ آیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی گود میں بیٹھ گیا اور آپ رضی اللہ عنہ نے اُس سے پیار کیا۔ اس (نامزد گورنر) نے کہا کہ امیر المومنین! میرے دس بچے ہیں لیکن کوئی میرے پاس پھٹک نہیں سکتا۔ اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اسمیں میرا کیا قصور! اگر خدا نے تیرے دل سے رحم نکال دیا ہے، تو میں کیا کروں؟ اس سے یہ کہا اور کاتب سے کہا کہ دستاویز پھاڑ دو۔ جو شخص اولاد کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش نہیں آ سکتا، وہ رعایا پر کیسے رحم کرے گا!

آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں انتظامیہ کے لئے کس قسم کے افراد کا انتخاب ہوتا تھا؟

جہاں تک ان کی گھریلو زندگی کا تعلق ہے وہ ''مشینی ضوابط'' کے تابع نہیں ہوتی تھی۔ انسانی لطافت اور نزاکت کا عکس ہوتی تھی۔ ایک دفعہ ایک شخص آپ رضی اللہ عنہ سے اپنی بیوی کی شکایت کر رہا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے بھائی! میاں بیوی کی زندگی میں تصوراتی (Ideal) معیار تلاش نہیں کیا کرتے۔ یہ عملی زندگی ہوتی ہے۔ اس میں دادوستد (Give and Take) کا مسلک اختیار کرنا چاہئے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے اہل وعیال میں بچوں کی طرح رہے، اور مرد صرف اس وقت بنے جب ان کی کوئی ضرورت اس کے سامنے آئے۔

''عمر رضی اللہ عنہ کا دُرّہ'' تو ضربُ المثل بن چکا ہے۔ لیکن اس دُرّے کی حقیقت کیا تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے۔ آپ رضی اللہ عنہ بازار سے گزر رہے تھے کہ دیکھا، ایک شخص شارعِ عام پر ایک عورت سے باتیں کر رہا ہے۔ غصہ آ گیا۔ گئے اور اسے ایک بید رسید کر دیا۔ اس نے کہا: امیر المومنین! یہ میری بیوی ہے۔ فرمایا: تیری بیوی ہے تو سرِ بازار اس سے باتیں کیوں کر رہا ہے۔ خواہ مخواہ مسلمانوں کو بدظنی اور غیبت پر مجبور کر رہا ہے!

اس نے کہا: امیر المومنین! ہم نو وارد ہیں۔ ابھی ابھی شہر میں داخل ہوئے ہیں۔ باہم مشورہ کر رہے ہیں کہ ہم کہاں ٹھہریں۔ یہ بات بہرحال اسی جگہ کھڑے ہو کر کی جا سکتی تھی۔

یہ سُن کر آپ رضی اللہ عنہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہی بید اس کے ہاتھ میں دیا اور کہا: اے بندۂ خدا! اپنا بدلہ لے لے۔ اس

نے معذرت کرتے ہوئے کہا:

امیر المومنین! یہ دُرّہ آپ کا ہے۔ آپ ہی اپنے ہاتھ میں رکھئے۔

اس کے جواب میں آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

سنو میرے بھائی! یہ دُرّہ نہ میرا ہے، نہ تمہارا۔ یہ اللہ کا دُرّہ ہے۔ اسے اللہ کی راہ میں اٹھنا چاہئے۔ اٹھانے والا کوئی ہو۔

اس نے کہا کہ: یہ درست ہے کہ یہ دُرّہ اللہ کا ہے۔ لیکن اللہ نے آپ ہی کو دیا ہے۔ یہ آپ کو مبارک ہو۔

یہ تھا وہ معاشرہ جو قرآنی قوانین وضوابط کی رُو سے قائم ہوتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ اس قسم کے تھے وہ انسان جنہیں قرآن تخلیق کرتا تھا۔ اور جن کے ہاتھوں یہ معاشرہ ترتیب پاتا تھا۔ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم باتیں کرتے ہیں اسلامی نظام، اسلامی قوانین، اسلامی شریعت کی، اور انہیں نافذ کرنا چاہتے ہیں موجودہ معاشرہ میں جس کی کوئی تک بھی اسلامی نہیں۔ جب وہ اس میں فٹ (Fit in) ہوتے نظر نہیں آتے تو طرح طرح کے اعتراضات اُبھرتے ہیں اور اس کا خمیازہ (بیچارے) اسلام کو بھگتنا پڑتا ہے، ہم سوچتے نہیں کہ سیکولر سٹیٹ یا تھیا کریسی میں اسلامی نظام قائم کیسے ہو سکے گا؟ اسلام تو انہیں مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس نے اسلامی نظام کے قیام کی شرطِ اوّل ''کفر بالطاغوت'' بتائی تھی۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ (2:256) ہم ''طاغوتی'' بنیادوں پر ''ایمان باللہ'' کی عمارت استوار کرنا چاہتے ہیں! نتیجہ ظاہر ہے۔ اسلامی قوانین اسلامی نظام ہی میں نافذ ہو سکتے ہیں۔

◆◆◆◆

آخر میں ایک اعتراض کا جواب، یا ایک نکتہ کی وضاحت۔

مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جب اسلامی قوانین وضوابط، اسلامی مملکت ہی میں نافذ ہو سکتے ہیں، اور اسلامی مملکت اس وقت دنیا میں کہیں بھی نہیں تو آپ اسلامی مملکت، اسلامی تصوّرات، اسلامی قوانین وغیرہ کی تحقیق میں اپنا وقت اور توانائی کیوں ضائع کرتے ہیں اور انہیں لکھتے لکھاتے کاہے کے لئے ہیں؟

اعتراض کی حد تک میں ان حضرات سے متفق ہوں، لیکن اس کے باوجود، میں جو، بقول ان کے ''اس سعی لا حاصل میں اپنا وقت اور توانائی ضائع کر رہا ہوں'' تو اس کا ایک خاص مقصد ہے۔ میں جب اپنے تاریخی سرمایہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اس میں اسلامی نظام، اسلامی ریاست یا اسلامی ریاست کے متعلق، قرآنی نقطۂ نگاہ سے لکھا ہوا کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔ وہ ہمارے (مسلمانوں کے) دورِ ملوکیت کی تاریخ ہے۔ اور ملوکیت میں، قرآنی نقطۂ نگاہ سے یا تو کچھ لکھا ہی نہیں جا سکتا تھا، اور اگر کسی صاحبِ ہمت نے اس کی جرأت کی ہوگی تو تھیا کریسی نے اس کا ایک ایک ورق ضائع کر دیا ہوگا۔ تھیا کریسی کی انتہائی کوشش یہ رہی ہے (اور ہے) کہ قرآن بے نقاب ہو کر اُمت کے سامنے نہ آنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جو کچھ اسلامی ریاست سے متعلق تحقیق کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے، وہ اسی دورِ ملوکیت کی ریاست کا نقشہ ہے جس پر اسلام کا لیبل لگا دیا گیا ہے۔

اندریں حالات، اگر کوئی شخص نیک نیتی سے بھی چاہے کہ معلوم کرے کہ صحیح اسلامی (قرآنی) ریاست اور سیاست کے اصول ومبانی اور خط وخال کیسے ہوں گے، تو اس کے لئے اسے تاریخ میں کوئی مواد نہیں ملے گا۔ بجز صدرِ اوّل کے منتشر واقعات کے۔ مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ میں قرآن پر اتھارٹی ہوں۔ لیکن میں نے بہرحال، اپنی عمر کا بڑا حصہ اس پر غور وتدبّر میں گزارا ہے اور اس کے ریاستی، سیاسی، معاشرتی، عمرانی، معاشی نظام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے حاصلِ مطالعہ وتدبر کو منضبط اور محفوظ کر جاؤں تاکہ اگر آنے والے کسی دور میں، کسی نے اس راستے پر چلنے کی کوشش کی، تو اس پر میرے نقوشِ قدم دیکھ کر شاید اس کا حوصلہ بندھ جائے کہ یہ راستہ ویرانہ نہیں۔ اس پر اس سے پہلے بھی کوئی گامزن ہوا ہے۔ اس طرح میری یہ کوششِ ناتمام، اس کے لئے مفیدِ مطلب ہو جائے۔ یہ ہے میرا مقصد جس کے لئے میں نے اپنی عمر کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آرہا ہوگا

اگر ایسا ہو گیا تو میں سمجھوں گا مجھے میری محنتوں کا صلہ مل گیا۔ ویسے اس وقت بھی ملک (اور بیرونِ ملک) انفرادی طور پر ایسے اربابِ دانش وبینش موجود ہیں جو میری قرآنی فکر کو بنظرِ استحسان دیکھتے اور اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اس طرح قرآنی تصوراتِ حیات کے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت نے ترہیب ونفرت کی جو فضا عام کر رکھی ہے، اس کے پیشِ نظر میں اسے بھی مغتنمات میں سے سمجھتا ہوں۔ میری حالت تو (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) یہ ہے کہ

مرا در عصرِ بے سوز آفریدند بخاکم جانِ پُر شورے دمیدند
چو نخ در گردنِ من زندگانی تو گوئی، بر سرِ دارم کشیدند

(ارمغانِ حجاز، ص:169)

اشعار کا مفہوم: مجھے سوز سے عاری زمانے میں پیدا کر کے میرے خاکی جسم میں پُرشور جان پھونک دی گئی۔ زندگی کو ریشم کے دھاگے کی طرح میری گردن میں ڈال کر گویا کہ مجھے دار پر کھینچ دیا گیا ہے۔ (ترجمہ از سلیمؔ)

اسی لئے میں ان حضرات سے کہا کرتا ہوں کہ

زمُرغانِ چمن نا آشنایم! بشاخِ آشیاں تنہا سرایم!
اگر نازک دلی، از من کراں گیر کہ خونم می تراود از نوایم!

(پیامِ مشرق، ص:26)

اشعار کا مفہوم: باغ کے پرندے میرے آشنا نہیں ہے۔ میں اپنے آشیانے کی شاخ پر تنہا بیٹھا نغمہ سرا ہوں۔ اگر تو کمزور دل ہے تو مجھ سے کنارہ گیر ہو، کیوں کہ میری نوائے (فکر) سے لہو ٹپک رہا ہے۔ (ترجمہ از سلیمؔ)

پرویزؒ

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خصوصی درس

8 جولائی 2018ء

کرو موسومز کا ذکر قرآن مجید کے حوالہ سے

اس سلسلہ میں میرا پہلا درس ستمبر، اکتوبر 2004ء میں بمقام سرسید میموریل لائبریری، لاہور کے زیرِ اہتمام ہوا تھا۔ پھر راجہ عبدالعزیز خاں (اب مرحوم) آف دھیرکوٹ، آزاد کشمیر کے ایک استفسار پر اس کی طویل وضاحت ماہنامہ طلوعِ اسلام بابت مئی 2014ء میں شائع ہوئی۔ اب سامعین کے تقاضا پر اسے ایک خصوصی درس کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ درس قرآنِ مجید کی 35ویں سورۃ فاطر کی آیات 27 اور 28 پر مشتمل ہے۔ جو مع ترجمہ درج ذیل ہیں:

27۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہَا ؕ وَمِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیۡضٌ وَّحُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہَا وَغَرَابِیۡبُ سُوۡدٌ ﴿۲۷﴾

کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ کئی پھل نکالے، جن کے رنگ مختلف، اور پہاڑوں میں سے کئی سفید اور سرخ قطعے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں اور کچھ سخت کالے سیاہ ہیں۔

28۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ کَذٰلِکَ ؕ اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ غَفُوۡرٌ ﴿۲۸﴾

اور لوگوں اور جانوروں اور چوپاؤں میں سے بھی کئی ہیں جن کے رنگ اسی طرح مختلف ہیں، اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں بے شک اللہ سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ نے ان آیات کا مفہوم درج ذیل بیان کیا ہے:

(27) ذرا غور کرو کہ بادلوں سے ایک جیسا پانی برستا ہے لیکن اس سے مختلف انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ (یہ نہیں ہوتا کہ سب پھل اور فصلیں ایک جیسی ہوں)۔

(28) اسی طرح انسان، دیگر حیوان اور مویشی بھی مختلف قسموں کے ہیں۔

صحیفۂ فطرت کے یہ اَوراق، جو قوانینِ خداوندی کی زندہ شہادات ہیں سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں، لیکن ان قوانین کی عظمت کے سامنے وہی لوگ جھکتے ہیں جو ان شہادات پر علم و بصیرت سے غور و فکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ ''علماء'' کہلانے کے

مستحق ہیں، اور یہی جان سکتے ہیں کہ خدا کا قانون کس قدر غلبہ کا مالک ہے، اور جو اس کے مطابق چلتا ہے، وہ اسے کس قدر سامانِ حفاظت عطا کرتا ہے (30:22-24؛ 3:190-191)

مندرجہ بالا ترجمہ ومفہوم سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ نباتات (ثمرات)، جمادات (پہاڑوں کے قطعات) اور حیوانی حیات (بشمول انسان) میں ایک تنوع اور بوقلمونی کا حوالہ دیا گیا ہے اور یہ بات علم کا نمایاں موضوع ہے۔ ''ترجمہ'' اور ''مفہوم'' کے تقابل میں ایک اور فرق بھی آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ ''اَلْوَان'' کا ترجمہ میں حوالہ ''رنگوں'' اور مفہوم میں ''انواع واقسام'' سے دیا گیا ہے۔

میں نے اپنے ہفتہ واری درس (سال 2004ء) کے دوران آیات مذکورہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ آیت (35:28) میں مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ میں ''ہٗ'' کی واحد کی ضمیر کے ساتھ جمع ''الوان'' کا آنا ظاہر کرتا ہے کہ یہاں ''رنگوں'' کے محض تذکرہ سے بڑھ کر (Chromosomes) کا تذکرہ ہے۔ یہی چیز ہے جس کی مزید وضاحت پیش کر رہا ہوں۔

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں، لون، رنگ اور Chrome کی لغوی تعبیر کو سامنے لاتا ہوں کیونکہ ان الفاظ کا مفہوم ذرا زیادہ وسیع ہے اور صرف رنگ مراد نہیں۔

لَوْنٌ (Laun) جمع الوان، اس کے معنی ہیں Sort, Kind, Shape, Form, Exterior, Colour اور Species (Steingass, Arabic - English Dictionary)

عربی لَوْنُ۔ اللَّوْنُ۔ ہر وہ خصوصیت جو کسی چیز کو دوسری چیز سے ممتاز کر دے۔ نوع، صنف، قسم، مختلف چیزوں کا سب سے پہلا امتیازی نشان ان کا رنگ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے معنی رنگ کے ہو گئے۔ (لغات القرآن از غلام احمد پرویزؒ)

انگریزی زبان میں Colour کا معنی ہے، رنگ۔ لون، ایک بصری احساس جو روشنی کے جواب میں آنکھ کی پتلی پر پیدا ہوتا ہے۔ مرئی خصوصیت جو ہیئت کے علاوہ کسی چیز کی روشنی سے اثر پذیری پر منحصر ہوتی ہے اور جس میں رنگ، چمک اور سیری کی صفات بھی شامل ہوتی ہیں۔ (قومی انگریزی۔۔۔ اردو لغت، شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان)

ان تفاصیل سے مقصد یہ بتانا ہے کہ لفظ اَلْوَانُ کے معنے صرف رنگ نہیں بلکہ اللَّوْنُ ہر وہ خصوصیت ہے جو ایک سے دوسری چیز کو ممتاز کر دے۔

اب آیئے انگریزی لفظ Chrome کی طرف۔ اس کے معنی ہیں، وہ جو مختلف جِلدی یا قدرتی رنگوں کا منبع ہو اور Chromosomes لونی رشتہ، لونی خیطہ، ہم لونی خلیۂ زوج کا گھنگریالہ یا دھاگے کے گچھے کی مانند اندرونی حصہ جس کے متعلق یہ خیال ہے کہ جین یا مورثہ کی ترسیل کرتا ہے۔ اسی طرح Chromosome کا معنیٰ کیا جاتا ہے لونیہ۔ لونی جسم۔ عصایا نخ نما دھاگے کی طرح جسموں میں سے ایک جس میں رنگیں جز ہوتا ہے اور جو اپنے اندر جین/مورثہ رکھتا ہے۔ ہر نوع کے لئے مورثوں کی تعداد مقرر ہے۔ یہ مورثے پودوں اور جانوروں کے تمام خلیات کے مرکزوں میں موجود ہوتے ہیں۔ لونی جسیمہ۔

اسی طرح جین Gene کروموسوم کی اکائی یا عنصر ہے جو کسی موروثی خصوصیت کو والدین سے اولاد تک منتقل کرتی ہے

اور اولاد میں کسی خصوصیت کی نمو کو متعین کرتی ہے اس کے علاوہ جین Gene میں سالموں کی کیمیائی ترکیب کی تبدیلی کے باعث کسی عضو میں نمایاں تبدیلی ہوجاتی ہے۔ جسے Gene Mutation کہتے ہیں۔ (قومی انگریزی۔۔۔اردو لغت)

سامعینِ کرام کروموسومز یا لونیہ کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے ایک عام آدمی کے لئے جاننا ضروری ہے کہ یہ بڑھتے پھیلتے اجسام میں کہاں واقع ہوتے ہیں۔ اس کے لئے زندہ اجسام کی بناوٹ کے ذمہ دار بنیادی خلیہ کو سمجھنا ہوگا۔ ہر زندہ شے ایک خلیے یا لاکھوں کروڑوں خلیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک خلیہ کا سائز چند مائکرو ملی میٹر یا اس سے قدرے زیادہ ہوتا ہے۔ (مائکرو ملی میٹر ایک ملی میٹر کا ہزارواں حصہ ہے)۔ اسی ایک خلیہ کے اندر جو صرف بڑی خوردبین کے ذریعے دیکھا جاسکتا ہے، کیا کیا چیزیں موجود ہیں۔ اس کے اندر خام مادہ سے خوراک پیدا کرنے کی فیکٹریاں موجود ہیں۔ پروٹین جو کہ زندہ جسم کا بلڈنگ میٹریل ہے۔ اس کو جوڑنے کا عمل بھی جاری ہے۔ ان میں رطوبتیں پیدا کرنے کا عمل بھی موجود ہے۔ (اسے آپ مشینری کو موبل آئل مہیا کرنے کا عمل کہتے ہیں)۔ ان میں نشاستہ بنا کر اسے سٹور کرنے کا عمل بھی موجود ہے۔ اسی طرح دوسری رنگدار چیزیں پیدا کر کے ان کو سٹور کیا جاتا ہے۔ اسی خلیہ کے اندر عملِ تولید کا مادہ بھی موجود ہے۔ اسی خلیہ کے اندر ٹرانسپورٹ کا سسٹم بھی موجود ہے جو خلیہ کے باہر سے مادہ کو اٹھا کر اندر لاتا ہے اور فالتو گلے سڑے مادے کو اٹھا کر خلیہ کے باہر پھینکتا ہے اور پھر دیکھئے کہ ہر فیکٹری کو توانائی کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بغیر کوئی کام نہیں چل سکتا۔ چنانچہ خلیہ کے اندر سانس کا عمل یعنی آکسیجن کی سپلائی کا خودکار نظام موجود ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے ڈاکٹر سید عبدالودود مرحوم کی کتاب ''مظاہرِ فطرت اور قرآن'' سے خلیہ کی ساخت کا ایک خاکہ (الگ طور پر) پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ خلیہ کے اندر کیا کیا چیزیں ہوتی ہیں۔ (دیگر تفاصیل بھی وہیں سے لی گئی ہیں)۔

نیوکلئیس کے گرد ایک باریک جھلی ہوتی ہے۔ اسے نیوکلیئر میمبرین کہتے ہیں اور سائٹوپلازم کے گرد ایک جھلی ہوتی ہے جسے سیل میمبرین کہتے ہیں۔ بعض خلیوں میں سیل میمبرین کے باہر ایک اور دیوار ہوتی ہے لیکن یہ زندہ شے نہیں ہوتی۔ اسے سیل وال کہتے ہیں۔

نیوکلیئر سیپ مائع چیز ہے۔ اس کے اندر کروموسومز اور ایک یا دو نیوکلیئس لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ بنیادی چیز اس کے اندر کروموسومز ہیں۔ کیمیائی لحاظ سے کروموسومز پروٹین اور نیوکلی اِک ایسڈ سے بنے ہوتے ہیں۔ جو دونوں کی ملاوٹ سے نیوکلیو پروٹین کہلاتے ہیں۔ نیوکلیو پروٹین کا زیادہ اہم حصہ نیوکلی اِک ایسڈ Dioxy Ribose Nucleic(DNA) Acid ڈی این اے کہلاتا ہے اور دوسرا حصہ Ribose Nucleic Asid(RNA) آر این اے، ہے۔ عملی طور پر کروموسومز کے اندر (Gene) جین کام کرتے ہیں۔

جین خلیہ کے اندر تمام اعمال کو کنٹرول کرتے ہیں۔ جس وقت خلیے کی تولید کا وقت ہوتا ہے، اس وقت کروموسومز زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ کروموسومز کی تعداد ہر نوع میں مختلف اور مقرر ہوتی ہے۔ مثلاً نوعِ انسان کے خلیہ کے اندر 46 کروموسومز ہوتے ہیں۔

Cell membrane
Ectoplasm
Endoplasm
Ribosomes
Nuclear membrane
Mitochondria
Yolk granules
Golgi bodies
Centrosome
Nucleolus
Nucleus
Chromatin
Plastid
Vacuoles
گولجی باڈیز
سینٹروسوم
نیوکلی اولس
نیوکلیس
کروماٹین
پلاسٹڈ
ویکیولز
سائیٹوپلازم
ایکٹوپلازم
اینڈوپلازم
رائبوسومز
نیوکلیائی جھلی
مائیٹوکانڈریا
زردی کے ذرات

انڈے کی ساخت

آپ کی دلچسپی کے لئے چند نباتی اشیاء اور چند حیوانی مخلوقات کے کروموسومز کی تفصیل دی جاتی ہے جس کی تخریج کے لئے میں جناب میاں داؤد حسین سابقہ ڈائریکٹر محکمہ جنگلات ووائلڈ لائف (جو شریکِ درس ہوتے تھے) کا شکر گزار ہوں۔ انہوں نے کوئی 200 کے قریب (Selected organisms) انواع واقسام کے کروموسومز کی فہرست دی تھی۔ ان میں چند ایک پیشِ خدمت ہیں:

نوع حیوانی	تعداد کروموسومز (2n)	نوعِ نباتی	تعداد کروموسومز (2n)
1۔انسان	46	21۔چاول	24
2۔گوریلا	48	22۔مرچ	24
3۔رہتسس بندر	48	23۔کارن مکّی	20
4۔لومڑی	36	24۔آلو جنگلی	24
5۔کتا	78	25۔آلو زرعی	72،48،24
6۔چوہا (ریٹ)	42	26۔آلو میٹھا	90
7۔چوہا (ماؤس)	40	27۔سیب	51،34
8۔گدھا	62	28۔گلاب کا پھول	42،28،14
9۔گھوڑا	64،66	29۔گنا	80
10۔بکری	60	30۔کپاس	52
11۔بلی	38	31۔سویابین	40
12۔بھیڑ	54	32۔مونگ پھلی	40
13۔شہد کی مکھی	16،32	33۔ٹماٹر	24
14۔عربی اونٹ	70	34۔شلغم	20
15۔کبوتر	80،79	35۔گاجر	18
16۔فاختہ	78	36۔پیاز	16
17۔مچھر	6	37۔گوبھی	18
18۔گھریلو مکھی	12	38۔مالٹا	36،27،18
19۔چھپکلی	36	39۔کھیرا	14
20۔ٹڈی دل	10	40۔باجرا	14

آج زندگی کی تخلیق، اس کے قرار اور کنٹرول کا انحصار مورثوں پر ہے۔ خلیہ کے اندر نیوکلیو پروٹین کی قسمیں DNA اور RNA کہاں کہاں موجود ہیں، کسی نے آج تک مورثوں کو دیکھا نہیں لیکن وہ اپنے کام کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ طبیعاتی طور پر مورثہ کروموسوم یا لونیہ کا حصہ نہیں ہوتا لیکن کیمیاوی طور پر ان کا وجود ظاہر اور مسلم ہے۔ یہ تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ مورثے DNA کے بنے ہوئے ہیں جو کہ چکر کھاتی ہوئی دوہری زنجیر کی مانند ہیں۔ ایک لونیے کے اندر DNA کا صرف ایک حصہ متحرک ہوتا ہے۔ زندہ اشیاء کی ہر نوع (Species) میں خلیہ کے نیوکلیئس کے اندر لونیوں کی ایک مخصوص تعداد ہوتی ہے۔ جیسے انسانی خلیہ میں 46 لونیے ہوتے ہیں۔

زیرِ نظر آیت (35:27) میں آسمان سے اترے ہوئے پانی (بارش) سے مختلف ثمرات (نباتات) کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ قرآنِ کریم کی دوسری آیات میں بھی ہے۔ مثلاً (39:21) اور (13:4) میں۔ ان کا مطالعہ موضوع کے بہتر فہم میں مفید ہوگا۔

آیت نمبر (39:21):

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پھر اسے چشموں کی صورت زمین میں چلایا۔ پھر وہ اس کے ساتھ کھیتی نکالتا ہے، جس کے رنگ مختلف ہیں۔ پھر وہ پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ پھر تُو اسے دیکھتا ہے پیلی ہونے والی۔ پھر وہ اسے چورا بنا دیتا ہے، بے شک اس میں عقل مندوں کے لئے یقیناً بڑی نصیحت ہے۔

آیت 13:4 اور اس کا مفہوم بھی ملاحظہ فرمائیں:

وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾

پھر اس پر بھی غور کرو کہ زمین کے مختلف قطعات، ایک دوسرے سے ملحق ہوتے ہیں (لیکن ان میں) کسی میں انگور کے باغ ہیں کسی میں کھیتیاں، کہیں کھجور کے درخت ہیں۔ ان میں سے بعض ایک ہی جڑ سے پھوٹ کر الگ الگ ہو جاتے ہیں، اور بعض الگ جڑوں سے اُگتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں، لیکن مختلف درختوں کے پھل، خوبیوں کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں (ایک میں ایک خوبی ہے تو دوسرے میں دوسری) اس طرح ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہوتی ہے۔

ان امور میں ایک سی آب رسانی اور متصل قطعاتِ زمین کے حوالہ سے زمینی پیداوار مثل کھیتی اور ثمرات کو مختلف رنگوں، ذائقے، تاثیر اور جسامت (اُکل) میں ایک دوسرے سے بڑھا ہوا بتایا ہے اور اس اختلاف میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں بتائی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی زمین سے بیج اور جڑ سے پیدا ہونے کے حوالہ سے ایک تو نوع (Species) ہے۔ جو نہیں

بدلتی اس لئے کہ اس کا سبب وہ Chromosomes ہیں جو اس نوع کا خاصہ ہیں البتہ اس کے رنگ، ذائقے تاثیر اور جسامت بدل جاتے ہیں۔ یہ اثر پذیری ہے جو مختلف زمینی عوامل اور ماحولیاتی اثرات کی قبولیت کا اظہار کرتی ہے۔ یہ کروموسومز جنہیں ہم اردو میں لونئے کہتے ہیں، خوراک اور ماحول سے متاثر ہو سکتے ہیں اور ہمارے زیرِنظر موضوع کے اعتبار سے مختلف رنگ اختیار کر سکتے ہیں۔

ان ہر دو حوالوں کے علاوہ قرآن کریم نے آیت (16:13) میں بھی بڑھنے اور پھیلنے والی مخلوق میں ''الوان'' کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کو سامنے رکھنا بھی مفید ہوگا۔

آیت (16:13) درجِ ذیل ہے:

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ---

ترجمہ: اور جو کچھ اس نے تمہارے لئے زمین میں پھیلا دیا ہے جس کے رنگ مختلف ہیں، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے یقیناً بڑی نشانی ہے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

اس آیت میں نوعِ انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کئے جانے والی مخلوق (نباتات وحیوانات جن کی خصوصیت بڑھنا اور پھیلنا ہے) کا تذکرہ ہے۔ ان کے مختلف ''الوان'' کا تذکرہ ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے یہ موضوع میرے درس میں سامنے آیا تھا۔ درس میں سیاق وسباق کو مدنظر رکھ کر بات کی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا آیات 28-35:27 سے قبل یہ آیات آئی ہیں:

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۲۶﴾ (35:25-26)

''اور اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو بلاشبہ ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلوں کے ساتھ اور صحیفوں کے ساتھ اور روشن کتاب کے ساتھ آئے تھے۔ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑ لیا جنہوں نے کفر کیا تھا تو میرا عذاب کیسا تھا؟''

ان آیات میں، رسولوں کی لائی ہوئی واضح دلیلوں اور قوانینِ خداوندی کی تکذیب پہلے لوگوں کا جرم بتایا گیا ہے اور یہ کہ ان کے کفر کے سبب ان پر گرفت ہوئی۔ زیرِنظر آیات 28-35:27 میں آسمان سے برسے پانی سے مختلف ''الوان'' کے پھل پیدا کرنے اور پہاڑوں میں مختلف رنگوں کے قطعات اور دھاریاں اور اسی طرح انسانوں، زمین پر رینگنے اور چلنے والے جاندار اور چوپائیوں کی ہر نوع میں مختلف والوان، کا تذکرہ ہے اور ان سب کے بارے میں اللہ کے بندوں میں سے علماء کی حیثیت کا تذکرہ ہے۔ اگر یہ مختلف الوان محض بصری احساس یا جمالیاتی ذوق کی تسکین یا رنگ شناسی کی بات ہوتی تو اسے انسان کے ذہنی ارتقاء کے مراحل کے حوالہ سے سمجھا جا سکتا تھا لیکن بات ذرا زیادہ وقیع ہے۔ وہ علماء جو ان اختلافاتِ الوان

کے اسباب وحقیقت سے آگاہ ہیں ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کے متعلق خشیت کا رویہ واحساس رکھتے ہیں۔ خشیت کا عام ترجمہ ڈر یا خوف کیا جاتا ہے لیکن اس لفظ کے مادہ ''خ ش ی'' کے مطابق کسی نقصان کے احتمال سے خوف زدہ ہوجانے کے لئے خشیۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے نیز اس میں احتمال، امید، توقع اور علم کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ خشیۃ اللہ کے معنٰی ہوں گے قوانینِ خداوندی سے سرکشی کے نتائج اور عواقب کا احساس جس کے ساتھ توقع، احتمال، اندیشہ اور علم کا پہلو بھی مضمر ہو۔ ان قوانین کے غیر متبدل اور لازمی طور پر نتیجہ خیز ہونے کے یقین سے ان کی عظمت اور قوت کا پہلو بھی۔

درحقیقت آیت ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو کسی چھپی ہوئی شے کا لازمی خاصہ ہو اور جب کوئی شخص اس ظاہری شے کا ادراک کرلے تو وہ جان لے کہ اس نے اس پوشیدہ شے کا ادراک یا اندازہ کرلیا ہے۔

ان آیات 35:27-28 میں نظر بظاہر تین گروپ بتائے گئے ہیں (1) زمینی زرعی پیداوار بشمول ثمرات، (2) زمینی ساخت/ پہاڑوں کی مختلف تہیں، (3) زمین پر زندگی (حیوانی سطح) کے تین شعبے، انسان، دوآبّ اور انعام (چوپائے) اور ان میں مختلف رنگوں کا حوالہ ہے۔

ظاہر ہے کہ نباتات میں مختلف رنگوں (Pigments) اور تبدیلیٔ الوان کا قانون الگ ہے جو حیات کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ جمادات (مثل زمین، پتھر، پہاڑ) ان میں اختلافِ الوان اور تبدیلیٔ الوان کا قانون، زندگی کے بغیر، کیمیائی تعامل پر مبنی ہے اور انہی قوانین کے تحت کنٹرول ہوتا ہے۔ لیکن متحرک زندگی میں (انسان، دوآبّ اور چوپائے) الگ قانون کے تحت اختلافِ الوان اور ان کا تغیر وجود میں آتا ہے۔ نباتات میں مختلف نباتی نوعوں کے الگ الگ رنگ ہونے کے ساتھ ساتھ، ایک ہی نوع میں تغیر الوان کا عمل بھی جاری رہتا ہے، جو سبزی سے پیلا اور پھر ٹوٹ پھوٹ کے بعد سیاہ ہوجاتا ہے۔ حوالہ کے لئے دیکھیں 39:21۔ یہ الگ قانون ہے۔

متحرک (چلنے پھرنے والی) زندگی میں، ہر نوع کا تعین اس کے سیل (Cell) کے مرکزہ میں Chromosomes کی تعداد پر منحصر ہے اور دوآبّ کی چند اقسام کے علاوہ انسانوں اور انعام میں پیدائشی رنگ میں بالعموم تغیر واقع نہیں ہوتا سوائے کسی بیماری یا "Cosmic Effect" کے۔ البتہ مختلف زمینی علاقوں، موسموں اور درجہ حرارتوں میں رنگ مختلف ہوجاتے ہیں اور یہ عمل ایک دونسلوں میں واقع نہیں ہوتا۔ Melanin کی جلد میں موجودگی یا اضافے سے رنگ کا فرق پیدا ہوجاتا ہے یا علاقائی زمینی اثرات اس کا باعث بنتے ہیں جیسے زرد نسل۔

ان حقائق کے پیشِ نظر دو سوال میرے سامنے آئے۔ پہلا یہ کہ زرعی نباتی پیداوار کا قرآن کریم میں تذکرہ واحد اسم (زرعاً) سے ہوا ہے اور الوان کی نسبت/ رجعت بھی ضمیر واحد سے مذکور ہے۔ اَلْوَانُہٗ (16:13، 39:21)۔ زیرِ نظر آیات میں پہلے ثمرات کا تذکرہ ہے اور ثمرات کے اسم جمع ہونے کے حوالہ سے مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا آیا ہے جو ''ھا'' غیر عاقل یا جمادات کے لئے جمع کی ضمیر ہے۔ اسی طرح جبال۔ جُدد جمع اسموں کے حوالہ سے ضمیر بھی جمع ''ھا'' استعمال ہوئی ہے لیکن الناس، دوآبّ اور انعام جمع اسموں کے باوجود، من کے قرینہ کے پیشِ نظر، ضمیر الوانہٗ میں ''ہٗ'' واحد ہے جبکہ رنگوں، اَلْوَانُ کو جمع

لایا گیا ہے۔ عربی زبان کی رُو سے اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے اَلْوَان مُختلف ہیں۔ افرادِ نوع کے رنگ مختلف ہو سکتے ہیں لیکن الوان کو جمع لانے سے ایک واضح قرینہ موجود ہے کہ ہر نوع میں الوان (رنگین جسیموں) کی تعداد مختلف اور متعین ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے Chromosomes کہتے ہیں۔ رہی بات تغیرِ الوان کی، تو یہ تغیر ہر نوع میں کروموسومز پر موجود Genes کے سبب ہوتا ہے جو باہمی تعامل کے سبب مختلف کردار ادا کرتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے حامل حیوانی جوڑے میں رنگ (علاوہ دیگر فیچرز کے) متعلقہ Dominant جین کے مطابق ظاہر ہوتا ہے جبکہ Recessive جین پس منظر میں چلا جاتا ہے اور پھر کبھی ظاہر ہوتا ہے جب وہ بطور Dominant جین اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ہر کسی کو معلوم ہے کہ:

"Colour of plants, animals, rocks, minerals and infact of all the living and non living objects around us, varies with their chemical and physical structure."

انسانوں، دواب اور چوپائیوں کا فزیکل سٹرکچر (ڈھانچہ) Genes کے تعامل پر مبنی ہوتا ہے جو بہرحال Chromosomes پر ہی واقع ہوتے ہیں۔ کروموسومز تو ہر نوع میں وہی مقررہ تعداد میں ہوتے ہیں البتہ ماحول، موسم، درجہ حرارت، زمینی پس منظر اور خوراک کے اجزاء سے متاثر ہو کر Genes اپنے مختلف افعال ادا کرتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے 35:28 میں مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جسے مدنظر رکھنا ہوگا اور یہی ''علماء'' کی ذمہ داری ہے۔

رہا یہ سوال یہ کہ علماء کو متعلقہ حصولِ علم سے کیا خشیہ لاحق ہوتا ہے، وہ کس قانون کی خلاف ورزی کے بُرے اثرات سے خوف زدہ ہوتے ہیں، تو اس سلسلے میں عرض ہے۔ کہ جمادات میں کیمیاوی تعامل کی خلاف ورزی سے نقصان رساں یا تباہ کن نتائج کا پیدا ہونا، بہ النزاع نہیں ہے۔ البتہ نباتات وحیوانات میں بہت دیر تک اس پر کم توجہ دی گئی۔ نباتات میں Grafting اور حیوانات میں Cross breeding کا عمل ان میں تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے۔ Grafting سے انسان نے نباتات اور پھلوں میں بے شمار پودے اور ثمرات بنائے ہیں۔ آموں میں سونفیہ، دودھیا اور جدید قسمیں وغیرہ اور سنگترہ یا کھٹی سے مالٹا کی اقسام، کینوں فروٹر اور موسمی وغیرہ پیدا کئے ہیں (یہ ہے ثمرات میں مختلف الوان سے حاصل کردہ علم کا نتیجہ)۔ اسی طرح گھوڑے اور گدھے کے نر و مادہ کے ملاپ سے خچر (بغال) وجود میں آیا جو بعض اوقات/ حالات میں ہر دو نسلوں سے زیادہ کارآمد ہوتا ہے لیکن اس سے آگے نسل نہیں چلتی۔ اسی طرح شہد کی مکھیوں کی دو اقسام کو کراس بریڈ کرانے سے شہد تو زیادہ اور بہتر ہو گیا لیکن ان کے ڈنگ مارنے کی صلاحیت بڑھ گئی جس سے اس نے شہد اور اپنی حفاظت کا بہتر انتظام کیا لیکن وہ انسانیت کے لئے فائدہ مند نہ ہوئی تو اسے ختم کرنا پڑا۔ دیگر حیوانی مثالیں، کتوں اور گائے بیل وغیرہ میں سامنے آئی ہیں۔

اب آیئے تیسرے گروپ کی نوع، انسانوں کی طرف۔ اس میں کروموسومز اور Genes کے اثرات سے انکار نہیں ہوسکتا۔ انسانوں میں سفید اور کالے لوگ اگر الگ الگ رہیں تو کالے لوگ اس زمانے میں سفید لوگوں سے I.Q میں 15 نمبر کم ہیں جس کا سبب ماحول، سہولیات، تعلیم و تربیت ہے۔ اسلام کی رُو سے تشکیلِ اُمت میں جب رنگ اور نسل کی بنیاد ختم کر کے اخوت قائم کی گئی تو یہ فرق ایک سوالیہ نشان بن گیا۔ ان سفید، کالی، زرد اور گندم گوں نسلوں کو جب قریب لایا گیا تو کبھی ملنے والی نسلوں کی اچھائیاں نئے بچوں میں آگئیں اور کبھی دو نسلوں کی خرابیاں نئی نسل کا نشان بن گئیں۔ یہ ہے وہ مقام جس سے ایک عالم کے لئے خشیہ پیدا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ متحرک زندگی میں مؤنث اور مذکر کے ملاپ کے وقت، خصوصاً انسانوں میں سیکس کروموسومز کی گروپنگ XX ہوتی ہے تو مؤنث کی پیدائش ہوتی ہے، XY ہو تو مذکر اور Monosomy XO ہو تو ضیاعِ حمل اور XXY ہو یعنی Trisomy-21 ہو تو ذہنی پسماندگی اور بے اولاد مرد کی صورت ظاہر ہوتی ہے۔ اسی کا حوالہ آیاتِ قرآنی (50-42:49) میں ہے۔ اس نقصان Catastrophe کا سبب Chromosomic یا Genetic Defect ہوتا ہے جسے Down Syndrome کہتے ہیں۔ صاحبانِ علم نے اس دور میں اس میدان میں خاصہ کام کیا ہے اور ایک نئے شعبہ علم Genetic Engineering میں ابتدائی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

جیسا کہ قرآنی آیات میں کسی نوع کی اپنی خصوصیات (Nature) اور ماحول، خوراک، موسم اور حرارت (Nurture) کے سبب تبدیلیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح نوعِ انسانی یا دیگر حیوانات میں ان عوامل کو عمل دخل حاصل ہے۔

The Role of Nature and Nurture and their interaction, determines the development of personality and I.Q.

دیکھنا یہ ہے کہ کروموسومز اور Genes کی حامل نوعوں کو جو ایک خاص ماحول، خوراک اور تربیت کے نظام میں رہی ہوں، کیا مناسب تبدیلیٔ ماحول، خوراک اور تعلیم و تربیت سے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ قرآنِ کریم کا اشارہ اسی طرف ہے۔ انسانی دنیا میں وہ ایک ایسے انسانی معاشرہ کا قیام کرنا چاہتا ہے جہاں ہر انسان کو اس کی بنیادی ضروریات اور حقوق حاصل ہوں اور اس کی جسمانی اور نفسیاتی نشوونماء اس کے اپنے خوابیدہ جوہروں کی تکمیل کا باعث بن سکے۔

یہ مرحلہ تو Nature اور Nurture کا تھا۔ اگلہ مرحلہ تغیرِ نفس کا ہے جس کے لئے وحی کو بنیاد بنا کر تعلیم و تزکیہ سے اگلے مراحل طے کئے جاسکتے ہیں (2:31، 2:37-38، 2:151، 3:164، 4:113، 62:2، 91:7-10) اور خشیۃ اللہ کے موارد کو 76:28، 62-56:60، 20-14:19 اور 31:33 میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

اللہ دتا ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، لاہور

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توبہ کا قرآنی مفہوم

(ایصالِ ثواب اور ایصالِ عذاب)

توبہ سے متعلق اصل مضمون شروع کرنے سے پیشتر ایک ضروری بات تحریر کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ جو اہم بھی ہے اور اس مضمون کا ملخص بھی۔ توبہ کوئی دعا پڑھ لینا یا کچھ الفاظ دہرانے کا نام نہیں ہے۔ توبہ ایک عملی اقدام ہے جس سے غلط کام کا نتیجہ ختم کیا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت آگے آتی ہے۔

ہمارے ہاں بہت سے الفاظ اور بہت سے نظریات ایسے مروج ہیں جن کا کوئی مفہوم نہیں ہے اور جو بالکل بے معنی ہیں۔ لاہور میں حضرت داتا صاحب کے مزار پر پندرہ پندرہ، بیس بیس لوگوں پر مشتمل ٹولیاں دستیاب ہوتی ہیں۔ آپ ان سے کہیں کہ مجھے مثلاً اپنے والد کو ایصالِ ثواب کرانا ہے۔ تو اس گروپ کا سربراہ آپ سے کچھ رقم لے گا اور چند پارے یا کچھ دعائیں تلاوت کر کے آپ کے والد کو ایصالِ ثواب کر دے گا۔ اس کے برخلاف ہمیں R.SS کے بانی ساور کر سے نفرت ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کا دشمن تھا ہم چاہتے ہیں کہ اُسے ایصالِ عذاب کرائیں۔ لیکن یہ ٹولی ایصالِ عذاب نہیں کراتی۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایصالِ ثواب تو ہو سکتا ہے لیکن ایصالِ عذاب نہیں ہو سکتا۔

ایک شخص غصہ میں یا مذاق میں اپنی بیوی کو زبان سے طلاق کا لفظ کہہ دیتا ہے تو علماء اس کو طلاق دینا گردانتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر طلاق کا لفظ تین مرتبہ دہرا دیں تو اس کو طلاق بائنہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ طلاق صرف زبان سے الفاظ ادا کر دینے سے ہو جاتی ہے، اس میں کوئی بھی Process نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی قانون کو سو مرتبہ یہ کہہ دے کہ میرا تیرا نکاح ہو گیا ہے تو وہ نکاح شمار نہیں ہوتا۔ اس کے لئے باقاعدہ عملی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہت عرصہ ہوا ایک فلم آئی تھی۔ جس میں حقیقی زندگی کے ایک جوڑے نے کام کیا تھا۔ شوہر اور زوجہ دونوں مشہور ہیں ہم ان کا نام تحریر کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس فلم میں بھی وہ شوہر اور زوجہ بنے تھے فلمی کہانی کے مطابق شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی۔ ہمارے علماء نے کہا کہ اس فلمی طلاق سے اُنہیں اصلی زندگی میں بھی طلاق ہو گئی اس لئے انہیں تجدید نکاح کرانی چاہئے۔

اللہ کی طرف رجوع کرو۔ اللہ سے جڑے رہو۔ اللہ سے چمٹے رہو۔ اس طرح کے الفاظ ہمارا مذہبی طبقہ دہراتا رہتا ہے جو الفاظ بالکل بے معنی اور بے مطلب ہوتے ہیں۔ لوگ عموماً اس کا مطلب یہ لے لیتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ پرستش کرو۔

نوافل کثرت سے پڑھو، تہجد پڑھو، ہمارے علماء اللہ سے جُڑے رہنے کا طریقہ پرستش کو قرار دیتے ہیں اللہ کی اطاعت کرنا ان کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمان اطاعت اور پرستش میں فرق نہیں کرتے۔ اس وقت ساری دنیا میں اللہ کی پرستش ہو رہی ہے۔ ایک گز زمین پر بھی بطور نظامِ قرآنی اللہ کی اطاعت نہیں ہو رہی۔ ہمارے ہاں پاکستان میں بھی اللہ کی پرستش ہوتی ہے۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب، ہندوستان کے صفِ اوّل کے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمارے دل میں ان کی بزرگی کی وجہ سے ان کا احترام ہے۔ وہ اقامتِ دین کے قائل نہیں ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ایک بڑی جامع اور بنیادی کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' ہے۔ یہ کتاب دین کی داعی ہے۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب نے مودودی صاحب مرحوم کی اس کتاب پر تبصرہ وانتقاد تحریر فرمایا ہے جس کا نام ''تعبیر کی غلطی'' ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے انتقاد کے سلسلہ میں جو تحریر کیا ہے اس میں سے دس مختصر ترین فقرے ہم جناب کے مطالعہ کے لئے پیش خدمت عالی کرتے ہیں۔

(1) تعلق باللہ سے مراد اللہ سے گہری وابستگی ہے۔ (صفحہ نمبر:153)

(2) زندگی کا اصل مقصد خدا سے تعلق پیدا کرنا ہے۔ اس سے لپٹ جانا ہے (صفحہ نمبر:214)

(3) اسلام دراصل خدا سے تعلق جوڑتا ہے۔ (صفحہ نمبر:277)

(4) دین کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا عنوان ہے (صفحہ نمبر:140)

(5) حج خدا کی پرستش کے محور پر اہلِ ایمان کی ایک عالم گیر برادری بنانا ہے۔ (صفحہ نمبر:138)

(6) اپنے رب سے قلبی اور روحانی تعلق پیدا کرنا (اصل دین ہے)۔ (صفحہ نمبر:148)

(7) (مودودی صاحب کے لٹریچر میں) اسلامی کا روحانی پہلو دب گیا ہے۔ (صفحہ نمبر:144)

(8) نماز قائم کریں۔ جس کی روح عجز اور اشتیاق کے ساتھ اپنے رب سے جڑ جانا ہے۔ (صفحہ نمبر:271)

(9) مگر ان کے اندرون کو نہیں جگاتا۔ (صفحہ نمبر:273)

(10) دین کی ایک آخری حقیقت ایک باطنی ادراک ہے۔ (صفحہ نمبر:301)

حضرت مولانا کی یہ کتاب 344 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں اسی قسم کے نظریات تحریر ہیں۔ کسی ایک بھی نظریہ کی تائید میں کوئی آیت درج نہیں ہے۔ یہ تمام نظریات قرآن کے خلاف، بالکل بے معنی ہیں۔ کوئی Concrete مفہوم ایک کا بھی سامنے نہیں آتا۔ ایک فقرہ بھی نہ قابلِ عمل ہے نہ کسی ایک فقرہ کا اس عملی دنیا سے کوئی تعلق۔ قرآن کریم ہر زمانہ کی انسانیت کے مسائل کو حل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہی اس کا وحی ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن ان نظریات کا قرآن کے اس دعویٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظریات صرف مولانا کے نہیں ہیں وہ ہندوستان کے مقبول ترین عالم ہیں اور ایک بڑی تعداد ان کو دنیا بھر میں Follow کرتی اور ان کو سراہتی ہے۔ یہ نظریات صرف مولانا کے نہیں ہیں، ہماری ساری پیشوائیت ساری طریقت، خود

مذہب اور سب مذہب زدہ لوگوں کے یہی نظریات ہیں۔ یہی وہ نظریات ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کیا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اس حالت تک پہنچایا ہے۔ معاف بفرمائید، مولانا کے سارے نظریات قرآن کے خلاف، بے معنی، ناقابلِ عمل ہیں۔ جب تک مسلمان ان نظریات کو ترک نہیں کریں گے، وہ ایں سوراندہ وآں سودر ماندہ ہی رہیں گے۔

توبہ کے معنی اور اس کا مفہوم امام راغب نے مفردات میں تحریر کیا ہے ''اعتذار کی تین ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ عذر کنندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کردے اور کہہ دے لَمْ اَفْعَلْهُ، میں نے یہ کیا ہی نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے لئے وجہ جواز تلاش کرے اور بہانے تلاش کرنے لگے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین دلائے۔ الغرض اعتذار کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور آخری صورت کو توبہ کہا جاتا ہے۔

اب آپ توبہ کا قرآنی مفہوم ملاحظہ فرمائیں:

آپ کو لاہور سے اسلام آباد جانا تھا۔ آپ غلطی سے ملتان جانے والی ٹرین میں سوار ہوگئے جو بالکل دوسری سمت کی طرف جارہی تھی کچھ دیر بعد آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، تو آپ پتوکی کے اسٹیشن پر اس ریل سے اتر گئے اور پتوکی سے آپ نے لاہور جانے والی گاڑی لی۔ آپ اگر پتوکی کے اسٹیشن ہی پر کھڑے ہوئے سو مرتبہ بھی زبان سے توبہ کہتے رہیں، آپ لاہور نہیں جاسکیں گے۔ توبہ ایک عملی اقدام ہے جس کے کرنے سے غلطی کا ازالہ ہوجاتا ہے۔ اور مُضرِ اثرات محو ہوجاتے ہیں۔ اس میں پہلا قدم غلطی کا احساس، دوسرا اور اہم قدم غلط روش کو ترک کرنا، اور تیسرا قدم صحیح راستہ اختیار کرنا ہے۔ جب کوئی شخص یہ تینوں مراحل طے کرتا ہے تب اس نے توبہ کی، اور اس کو توبہ کرنا کہتے ہیں۔

غلط کام کرنے کے دو طرح کے اثرات ہوتے ہیں۔ ایک اثر تو معاشرہ پر ہوتا ہے جو جرم کہلاتا ہے اور دوسرا اثر اس غلطی کنندہ کی ذات پر ہوتا ہے جسے گناہ کہا جاتا ہے۔ آپ نے کسی شخص کے ایک ہزار روپے مار لئے۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو احساس ندامت ہوا۔ آپ اس کے پاس جائیں۔ اس کی رقم اس کو ادا کریں اس سے معافی مانگیں اور پکا عہد کریں کہ آپ آئندہ کسی کی کوئی رقم نہیں ماریں گے یہ آپ کی توبہ ہوگی۔ یہ توبہ صرف توبہ کا لفظ دہرانے سے نہیں ہوتی۔ نہ توبہ کی تسبیح پڑھنے سے۔

اس جرم کو آئندہ نہ کرنے کی اس توبہ سے آپ کی ذات پر جو بُرا اثر ہوا تھا وہ محو نہیں ہوا۔ اس کے لئے آپ اس شخص سے معافی مانگیں گے، اس کی رقم ادا کریں گے، اس کے بعد آپ دو ہزار روپے کسی اچھے کام پر خرچ کریں گے تو آپ کے اس جرم کا غلط اثر محو جائے گا کیونکہ قرآن کریم نے فرمایا: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114)، اعمال حسنہ میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ غلط اعمال کے نقصان رساں نتائج کا ازالہ کردیتے ہیں۔

قرآن کریم میں توبہ کا عمل نہ تو یہودیوں کی طرح ایسا Rigid ہے کہ غلطی کی معافی کا امکان ہی نہ ہو۔ اور نہ ہی عیسائیوں کی طرح ایسا نرم ہے کہ جس میں کسی کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک شخص جرم کئے جاتا ہے اگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے

کفارہ پر ایمان لے آئے اور پادری کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہے تو اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔

سورۂ مریم میں ارشادِ عالی ہے: فَاَمَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ مِنَ الۡمُفۡلِحِیۡنَ (28:67) جس نے اس کے بعد اپنی روش بدل لی اور وہ کام کئے جو انسانوں کی صلاحیتوں کو بڑھانے والے ہوں۔ فَعَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ مِنَ الۡمُفۡلِحِیۡنَ (28:67) اس کی کھیتی پروان چڑھ جائے گی۔

سورۂ مریم میں ارشادِ عالی ہے: اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ (19:60) فَاَمَّا مَنۡ تَابَ، جو اس چوراہے پر لوٹ آیا۔ وہ اس مقام پر آ گیا جہاں سے اس نے غلط راستہ اختیار کیا تھا پھر عَمِلَ صَالِحًا (19:60) صحیح راستہ پر چل پڑا۔ اس نے دونوں اقدامات اختیار کئے۔ پہلے صحیح راستہ پر آنا۔ پھر اس صحیح راستہ پر چلا، تو وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

مذہب میں توبہ، منہ سے توبہ کہنا، یا توبہ کی تسبیح پڑھنا ہوتا ہے۔ دین میں توبہ غلطی کا احساس، احساس کے بعد غلط کام کو چھوڑنا، درست راستہ اختیار کر کے اس پر چلنا ہوتا ہے۔ توبہ کرنا ان تین اقدامات پر مشتمل ہوتا ہے صرف منہ سے توبہ توبہ کہنے سے توبہ نہیں ہو جاتی۔

جامِ مے توبہ شکن، توبہ مِری جام شکن سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

کوئی دعویٰ نہیں

کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآن کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہو سکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کر دیتے ہیں انہیں تحریکِ طلوعِ اسلام کی طرف، وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لیے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔ (پرویزؒ، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

(پیڈ ایڈ)

خواجہ ازہر عباس کی تصانیف

خواجہ ازہر عباس صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں اور کتابچے ذیل میں دیے گئے فون نمبر پر رابطہ کر کے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

1۔قرآن فہمی کے قرآنی قوانین
2۔احمدیت (جس کے تمام عقائد خلافِ قرآن ہیں)
3۔مسلمانوں کے زوال میں پرستش کا کردار
4۔حضرت امام مہدی کی آمد کا عقیدہ
5۔اسلامی نظام اس وقت کی اہم ضرورت ہے
6۔اسلام مذہب کے خلاف سراپا احتجاج ہے
7۔اقامت دین فرض ہے
8۔جمع وتدوین قرآن وحدیث
9۔اعجاز القرآن
10۔انسانیت کی آخری پناہ گاہ
11۔زندہ اور زندگی دینے والا دین
12۔ذہن جو قرآن بناتا ہے۔
13۔تحریکِ طلوعِ اسلام کا بلند مقام
14۔تحریکِ طلوعِ اسلام اقامت دین کی واحد تحریک
15۔Spirituality
16۔روحانیت
17۔قرآنِ کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے
18۔عقیدۂ الہام خلافِ قرآن ہے
19۔دین ومذہب کے فاصلے
20۔حدیث قرآن کی رو سے
21۔عورت پر تشدد
22۔تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف

خواجہ صاحب کی کتابیں انٹرنیٹ پر بھی موجود ہیں جو مندرجہ ذیل لنکس سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

خواجہ ازہر عباس صاحب کی کتابوں کا ایک موبائل ایپ آپ گوگل پلے سٹور سے Kawaja Azhar Abbas EBook لکھ کر ڈاونلوڈ کر سکتے ہیں۔

www.azharabbas.com ویب سائٹ سے بھی ڈاونلوڈ کر سکتے ہیں۔

اور www.facebook.com/azharabbas سے ڈاونلوڈ کر سکتے ہیں۔

نیز www.youtube.com/azhaabbasofficial سے مختلف موضوعات پر ان کی مختصر ویڈیوز دیکھ سکتے ہیں۔

Amazon سے ان کی کتابیں خرید سکتے ہیں۔

پاکستان سے کتابیں حاصل کرنے کے لئے اس نمبر پر رابطہ کریں:

کوکب شیرازی 0313-4763936

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ملائکہ کا اللہ کے تدبیرِ امور سرانجام دینے کی قوت کا تصور

قرآن کی عالمِ امر میں کائنات کے عدم سے وجود میں لانے کی وضاحت:

لہٰذا ہمیں ذہن میں رکھنا ہوگا کہ عالمِ امر میں خدا کے عمل، خدا کے ارادے، خدا کی منشاء کو، خدا کی مشیّت کو فَعَالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ اور یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ کہا ہے۔ یعنی عالمِ امر میں، صرف خدا کا ارادہ، عمل یا مشیّت چلتی ہے۔

خدا نے یہاں انسان کو انسانی زبان میں سمجھانے کے لئے کہا کہ جب وہ اپنے ارادے کو، اپنے پلان کو، اپنی اسکیم کو، اپنی منشا کو کہتا ہے کہ ''کُن''، تو اس کا ارادہ بروئے کار آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ارادہ کس طرح بروئے کار آتا ہے، ہم نہیں جان سکتے۔ خدا سچ مچ ''کُن'' کا لفظ ادا نہیں کرتا، یہ تو خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لئے ایسا کہا ہے، ورنہ ہم عالمِ امر کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔

دنیا کا بڑے سے بڑا سائنسدان بھی جواب نہیں دے سکا کہ کائنات اور ہم عدم سے کیسے وجود میں آئے؟ ابھی تک ہمارا علم اِس کی تحقیق میں مصروف ہے۔ کائنات کے آغاز اور سلسلہ علت و معلول کی اوّلین کڑی کا مسئلہ لاینحل ہے اور سائنس اس حد تک نہیں پہنچ سکتی۔

حقیقت تو یہی ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا سائنسدان بھی عقل کے استعمال سے جواب نہیں دے سکتا کہ کائنات اور ہم عدم سے کیسے وجود میں آئے؟ کائنات کی اولین کڑی عدم سے وجود کا لاینحل مسئلہ ایک راز ہے، جو اِنسانی عقل کے حیطہ اِدراک کے دائرہ میں نہیں لایا جا سکتا۔

قرآن میں تخلیق سے قبل عالم عدم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سمجھایا ہے کہ:

هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡکُوۡرًا (76:1)

کیا وقت کے زمانے (الدہر) میں، انسان پر ایسا وقت نہیں گزرا، جب وہ انسانی وجود میں نہ تھا؟ (یعنی مخاطب کرنے کے قابل ہی نہ تھا)۔

لَمۡ یَکُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡکُوۡرًا: ''جب انسان، انسانی وجود میں نہ تھا''۔ ہمارے ہاں اردو میں ''مذکور'' کے معنی ''قابل ذکر یا جس کا ذکر پہلے ہو چکا'' کیا جاتا ہے، لیکن عربی میں مذکور کے معنی ہیں وہ جو خود اپنے وجود میں موجود ہو۔ یعنی، جیسے خدا ہے۔

پہلی بات تو انسان کے متعلق یہ آ گئی کہ عالم امر میں اس کا وجود نہ تھا، اور دوسری بات یہ کہ عالم خلق میں یہ خود بخود اتفاق سے وجود میں نہیں آ گیا ہے۔ اس کی تخلیق خدا نے ہی کی ہے۔

قرآن کریم اور عربی زبان میں وقت کے لئے دو الفاظ ''دہر'' اور ''عصر'' آتے ہیں۔ ''ابتداء سے انتہا تک طویل المدّت عرصے'' کو عرب ''دہر'' کہتے تھے اور اِس کے تھوڑے عرصے یا وقت کو وہ عصر یا زمان کہتے تھے۔ بہرحال قرآن نے یہاں ''دہر'' کہا ہے۔ یہ آگے وضاحت ہو رہی ہے کہ انسان کے متعلق عالم امر یعنی ازل میں پلاننگ سے لے کر اسکو اختیار و ارادہ عطا کرنے کا عرصہ ''الدہر'' ہی میں آیا ہے۔ عالم امر یعنی ازل میں تو اس کا وجود ہی نہ تھا۔ البتہ عالم خلق میں یہ وجود میں تو آ گیا تھا، لیکن انسان کہلانے کے قابل نہیں ہوا تھا، یعنی یہ انسانی وجود میں نہ تھا۔ اسی ازل سے ہمیشہ رہنے والے وقت (ٹائم) الدھر کے دوران، خدا نے اسے اس قابل بنا دیا کہ یہ ذات یعنی اختیار و ارادے کا مستحق ٹھہرا۔ اب آیت کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ''دہر کے ٹائم میں کیا انسان پر وہ عرصہ نہیں گزرا، جب یہ انسانی وجود میں ہی نہ پہنچا تھا''۔

قرآن سے ہی ہمیں راہنمائی ملتی ہے کہ:

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴿۱۳﴾ (85:13)

وہ (خدا) ہر شے کی پیدائش کا، ایک پست ترین نقطہ سے آغاز کرتا ہے، اور پھر مختلف ارتقائی مراحل میں سے گزار کر، شے کو نقطہء تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔

اس آیت میں دو لفظ ہیں یُبْدِئُ اور یُعِیْدُ۔ ''یُبْدِئُ'' کے معنی ہیں ابتدا کرنا۔ سوال یہ ہے کہ جب کچھ نہیں تھا تو یہ کائنات کیسے عدم سے وجود میں آ گئی؟ یہ وہ نقطہ ہے، جس نے انسان کو ورطہء حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اس سوال کے جواب میں پہلا انسان حیرت کے جس مقام پہ تھا، اسی مقام پہ آج کا انسان بھی ہے اور آخری انسان بھی حیرت ہی کے مقام پہ ہوگا کہ کائنات کی ابتدا کہاں سے ہوگئی؟ یہ سلسلہء کائنات کیسے وجود میں آ گیا؟ دہریوں نے کہہ دیا کہ کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ کائنات وجود میں آ گیا۔ خدا پہ ایمان والوں نے کہہ دیا کہ خدا اس کو عدم سے وجود میں لے آیا۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کہاں سے آ گیا؟ یہ مقام، عقل کے بس کی بات نہیں ہے، کیونکہ عقل انسانی محدود ہے اور خدا لامحدود ہے، اور لامحدود، محدود میں نہیں سما سکتا۔ خدا کو ماننے والے، دہریوں سے پوچھتے ہیں کہ تم کہتے ہو کہ کائنات از خود وجود میں آ گئی ہے، تو بتاؤ کائنات از خود کیسے وجود میں آ گئی ہے؟ اس کا تو ضرور کوئی خالق ہوگا، جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اس دلیل سے خدا کو ماننے والے سمجھتے ہیں کہ ہم خالق تک پہنچ گئے ہیں اور دہریوں کو شکست دے دی ہے۔ اس کے بعد دہریوں کی طرف سے اعتراض آتا ہے کہ جب تم خود مانتے ہو کہ بغیر خالق کے کوئی شے وجود میں نہیں آ سکتی، تو پھر جسے تم خالق کہتے ہو، جسے تم خدا کہتے ہو، وہ پھر بغیر خالق کے کیسے وجود میں آ گیا؟ اس کا جواب عقل انسانی نہیں دے سکتی۔ یہاں پہنچ کر از خود موجود خالق کو ماننا ہی پڑتا ہے، ''فرض'' کرنا پڑتا ہے، کہ وہ ایک ایسی ہستی ہے، جس کا کوئی خالق نہیں ہے، اور وہ از خود ہے۔ حساب میں ایک کلیہ فرض کرنے

کا ہے۔ اگر فرض نہ کیا جائے، تو حساب کا سوال نکلتا ہی نہیں۔ کیونکہ خدا کو فرض کرنے سے انسانی دنیا کے سوالات کا حل ملتا چلا جاتا ہے، اس لئے ہم خدا کو ازلی وابدی ''فرض'' کرتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایک نہیں بلکہ تمام انبیائے کرامؑ کی، خدا کی طرف سے عطا کردہ تعلیم کے انسانی معاشرے میں مثبت نتائج یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ خدا کو ٹھیک فرض کیا گیا ہے۔

قرآن خدا کو فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (12:101) اور بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6:101) کہتا ہے یعنی ابتداء کرنے والا۔ اس ابتدا سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا ہر شے، جس طرح آج موجود ہے، کیا اسی طرح ابتداء سے وجود میں آ گئی تھیں؟ انسان کا ذہن تو موجودہ وجود ہی کو شے کی ابتداء سمجھتا چلا آ رہا تھا، لیکن ہمارے دور میں یہ چیز سامنے آئی کہ نہیں! اشیاء کی ابتداء تو بہت ہی پست ترین حالت سے، حقیر سی حالت سے وجود پذیر ہونا شروع ہوئی ہے، پھر ہر شے مختلف ارتقائی مراحل میں گردشیں کرتی ہوئی، مختلف منازل طے کرتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی، موجودہ شکل یا ہیئت میں پہنچیں ہیں۔ اس نظریۂ ارتقاء کی ابتداء اٹھارویں صدی عیسوی میں ہوئی، جس میں کہا گیا کہ دنیا میں موجودہ اشیاء کی ہیئت ابتداً میں بالکل مختلف تھی۔ اشیائے کائنات، آہستہ آہستہ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، آج کی تکمیلی شکل میں پہنچیں ہیں۔ یعید کے معنی پلٹنا، لوٹنا اور کسی چیز کو اس طرح ارتقائی گردشیں دینا ہے کہ شے اپنے معیار یعنی تکمیل تک اس طرح پہنچ جائے کہ جس کے بعد مزید ارتقائی گردشوں کی ضرورت نہ رہے۔ ہم اس کو شے کی آخری منزل کہیں گے، جہاں آگے مزید ارتقائی گردشیں ختم ہو جائیں۔ گردشوں کے اختتام سے ارتقاء کی لامتناہیّت کا تصوّر بھی ختم ہو گیا، ورنہ ایک اور مشکل پیدا ہو جاتی کہ جہاں شے کی ابتداء معلوم نہ تھی وہاں شے کا ارتقاء ابدی ماننا پڑتا۔ صفتِ ابتداء وانتہا صرف خدا کی ذات کے لئے ہے۔ شے یعنی مخلوق کو ابتدا میں تو آنا ہے، لیکن اس کے بعد اس کی معاد یعنی تکمیل کی انتہا بھی ہے۔

قرآن کریم کے مختلف مقامات پر اس قسم کی آیات آتی ہیں۔

وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (2:117)

''اور جب وہ ایک کام کا حکم کرتا ہے تو اُسے کہہ دیتا ہے 'ہو' سو وہ ہو جاتا ہے۔''

خدا کا امر (تدبیر) کا کیا ہوتا ہے اور کس طرح عمل پیرا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ ''کُن'' کے بعد خدا کا ارادہ شے کے بہت پست ترین نقطے میں ڈھل جاتا ہے اور شے عالم خلق میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اب شے پر طبیعی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خدا کے عالمِ امر کے تخلیقی پروگرام میں ایک ایسا مرحلہ بھی متعارف ہوتا ہے۔ جو محسوس بنیادی عناصر کو عدم سے وجود میں لانے کا ہے۔ اس کے لیے قرآن نے بَدَعَ اور فَطَرَ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یعنی کسی شے کو پہلے پہل وجود میں لانا۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو:

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (2:117)

''(مادہ کے بغیر) عدم سے آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔''

مزید یہ کہ:

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (12:101)

''عدم سے آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا۔''

یعنی وہ (خدا کی) ذات جو عناصر کائنات کو پہلے پہل عدم سے وجود میں لائی۔

واضع رہے کہ نہ تو قرآن کریم کوئی سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی اس وقت ہمارا موضوع مادہ کی سائنٹیفک تشریح ہے۔ ہمیں کہنا صرف یہ ہے کہ مفردات اپنی محسوس شکل میں ہوں یا توانائی کی صورت میں اصل سوال مسئلہ ارتقاء کا یہ ہے کہ یہ وجود میں کیسے آ گئے۔ قرآن کریم نے اسے ''بَدَع'' اور ''فَطَر'' سے تعبیر کیا ہے، یعنی یہ کہہ دیا کہ خدا انھیں عدم سے وجود میں لے آیا۔ اس سے آگے بات انسان کے حیطہ ادراک میں آ ہی نہیں سکتی۔ ہمارا ذہن یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ کوئی شے عدم سے کس طرح وجود میں آ سکتی ہے۔ یہ اشیاء موجود ہیں۔ ان کے وجود سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ وجود میں کیسے آ گئیں۔ آئن سٹائن جیسا عظیم سائنس دان بھی کہہ سکا تو فقط اتنا کہ:

''طبعی سائنس نے اب تمام اشیاء کو حرکت میں تبدیل کر دیا ہے..... کائنات، جو ہمیں اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہیں۔ ایک ٹھوس شے نہیں، جو فضا میں پڑی ہے۔ یہ شے ہے ہی نہیں بلکہ عمل ہے یا حوادث کی عادت۔''

کائنات کی محسوس شکلوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے، اس کے لیے طبیعات کے پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کا مقولہ زبانِ زدِ عام ہے کہ:

''نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیّر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لیے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے۔''

سامنے آتا ہے۔

قرآن نے عالمِ امر ہی میں نظریہ ارتقاء کے بنیادی طریقہ کار کا بنیادی اصول بیان کر دیا ہے، جو تفضیلی تجزیہ کا متقاضی ہے۔

عالمِ امر میں اللہ کے تخلیقی امور میں نظریہ ارتقاء کی پابندی:

قرآن میں اللہ نے اپنے مخصوص عمل کے میدان میں امورِ تخلیق میں یہ اصول و طریقہ کار کا قانون بنایا کہ:

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (32:5)

اللہ کے عالمِ امر میں ایک اسکیم سامنے آتی ہے، جس میں اُس کے تکمیلی السماء کے مراحل طے ہوتے ہیں۔ اسکیم کا آغاز،

اُس کے پست ترین نقطہ ارض سے ہوتا ہے۔ اور اسکیم اُس السماء کے طے شدہ نقطہ تکمیل کی طرف عروج کرتی جاتی ہے۔ عروج کی اِن منازل میں ایک یوم کی مدّت تُمہارے (یعنی اِنسانی) حساب وشمار کے مطابق ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔

متقدمین کے مفسرین میں سے ایک مستند مُفسر اِبنِ کثیر نے اس کا مفہوم یوں بیان کیا ہے کہ:

وہ (خدا) آسمان سے زمین کی طرف کاموں کی تدابیر اُتارتا ہے۔ پھر ایک ہی دن میں اس کی طرف چڑھ جاتا ہے جس کا اندازہ تمہاری گنتی کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔

قرآن نے اِس آیت میں دیکھا جاسکتا ہے کہ اِنسانی تخلیق کے پانچ درجات کا زکر یوں کیا گیا ہے کہ:

1۔ خدا کا طریقِ تخلیق یہ ہے کہ اِس کے عالمِ امر میں ایک اسکیم سامنے آتی ہے (یُدَبِّرُ الْاَمْر)

2۔ اور اسکیم کے تکمیلی مراحل (مِنَ السَّمَآء) طے ہوتے ہیں۔

3۔ اسکیم کا آغاز، اُس کے پست ترین نقطہ (اِلَی الْاَرْضِ) سے کرتا ہے

4۔ اور اسکیم اُس طے شدہ نقطہ تکمیل (السماء) کی طرف قانون ارتقاء کی رو سے، عروج کرتی جاتی ہے (یَعْرُجُ اِلَیْہِ)۔

5۔ اِرتقائی منازل کی ایک یوم کی مدّت تمہارے حساب وشمار کے مطابق ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے (فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ)۔

قرآن کے اِن تدریجی مراحل کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے بہتر ہوگا کہ اِس آیت میں درج اہم الفاظ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم کو سامنے لایا جائے۔ اِن کے مفہوم میں ہی ہمیں بغائر مطالعہ سے قرآنی نظریہِ ارتقاء کا بیان ہی واضح ہوتا نظر آتا ہے۔

1۔ اِس آیت کے پہلے یُدَبِّرُ الْاَمْر کے مرحلہ میں دبر کے لغوی بنیادی معنی کسی شے کے آخر تک، نقطہ تکمیل تک کی جو حالت ہے، اُس کو سامنے رکھ کر بات کا شروع کرنا ہوتے ہیں۔ یہاں الامر سے مراد عالم امر ہے جس کے قرآن کے اصطلاحی مفہوم سے پچھلے باب میں ہم آگاہی حاصل کر چُکے ہیں۔ عالمِ امر صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی مخلوق اس کا اِدراک نہیں کرسکتی، کیونکہ یہ خدا کی تخلیقِ کائنات کی پلاننگ اسکیم ہے۔ عالم امر میں عالمِ تخلیق کے برعکس خدا کی اسکیم کے طے ہونے میں وقت ہی نہیں لگتا۔ وقت کا شمار تو ہماری دنیا میں ہوتا ہے۔ ہماری دنیا میں ارتقاء کا ایک ایک مرحلہ ہزار ہزار اور بعض مراحل پچاس پچاس ہزار سالوں پر محیط ہوتے ہیں۔ عالم امر میں، خدا کا کسی شے کے متعلق، صرف ارادہ ہوتا ہے۔ اس ارادے کو کن سے تعبیر کیا ہے، جس کا تعلق عالم امر سے ہے۔ خدا نے ہمیں سمجھانے کے لئے کن کہا ہے، ورنہ خدا کن بھی نہیں کہتا، کیونکہ ''کن'' کہنے میں بھی تو کچھ نہ کچھ وقت صرف ہوتا ہے۔ عالم امر میں تدریجی بات نہیں ہوتی کہ وہاں آہستہ آہستہ خدا کے ارادے کا نقشہ بنے یا آہستہ آہستہ شے سے متعلق قانون بنے۔ خدا نے عالم امر میں، اسکیم یا شے کا پہلے ہی سے درجۂ کمال طے کیا ہوتا ہے۔ اسکیم یا شے بتدریج اوپر اٹھتی ہوئی اپنے درجۂ کمال کی طرف جاتی ہے اور بتدریج عالمِ امر میں طے شدہ تکمیل کے درجۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔

2۔ آیت کے دوسرے مرحلہ میں سماء کے معنی آسمان اور ارض کے معنی زمین لئے جاتے ہیں، لیکن راغب نے کہا ہے کہ بنیادی طور پر سماء بلندی کو کہتے ہیں اور ارض پستی کو کہتے ہیں۔ لفظ السماء کی بھی تصریح راغب کی لغات میں یوں ملتی ہے کہ ہر شے کے بالائی حصہ کو سمَاء کہا جاتا ہے۔ اس میں ارض کی وضاحت بھی یوں ہو جاتی ہے کہ ہر سماء اپنے ماتحت ارض کے لحاظ سے سماء ہے لیکن سماء اپنے سے مافوق کے لحاظ سے ارض کہلاتا ہے۔ لہذا یہاں اِس آیت میں ''یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ'' میں کہا گیا ہے کہ خدا پہلے ایک اسکیم کی تدبیر کرتا ہے، اور وہ اسکیم بلندی کے اوپر طے ہوتی ہے یعنی تخلیق سے پہلے، اسکیم کا تکمیلی نقطہ طے ہوتا ہے۔

3۔ تکمیلی منزل کے طے ہو جانے کے اُس کی تخلیق کا آغاز اِلی الارض کے تیسرے مرحلہ میں اُسے ارض کے پست درجہ سے شروع کیا جاتا ہے۔

4۔ چوتھے مرحلہ میں آیت کا اگلا حصہ ہے ''ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ'' ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ پھر پست ترین نقطہ سے جو وہ شے آغاز میں ہوئی ہے، تو وہ قانون ارتقاء کی رو سے، اِسے بلندیوں (السَّمَآءِ) کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں لفظ یَعْرُجُ کے معنی بلندی کے ہیں۔ جس سے ہمارے ہاں لفظ عروج ہے۔ اِس کے معنی ہوتے ہیں کہ سیڑھیوں کے ذریعے اوپر چڑھنا، یعنی بتدریج، درجہ بدرجہ، بلند ہونا۔ اِسی مادہ سے لفظ معراج کے معنی سیڑھی ہوتے ہیں، یعنی یہ شے یکلخت کسی کو بلند نہیں کرتی بلکہ بتدریج بلند کرتی ہے۔ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ میں ''ہ'' کی ضمیر مذکّر ہے، اس لئے ''ہ'' السَّمَآءِ مؤنث کے لئے نہیں آسکتی۔ یَعْرُجُ لفظ کے بعد اِلَیْہِ میں یہ اِلیٰ جو ہے وہ سمت کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور الیہ کی اِس ''ہ'' نے بات واضح کر دیا ہے کہ یہ وہ نقطۂ تکمیل ہے، جو اُس کے لئے طے کیا گیا تھا۔

5۔ پانچویں اور آخری مرحلہ میں سائنس کے انکشافات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ زندگی کا نقطۂ آغاز پہلے جرثومہء حیات اور قرآن کی زبان میں نفس واحدہ سے ہوا ہے۔ ہزار ہا سال میں ارتقاء کا کہیں ایک مرحلہ طے ہوتا ہے۔ جرثومۂ حیات ایک طویل عرصہ کے بعد، آگے بلندی کی طرف یعنی اپنے تکمیلی نقطے کی طرف بڑھا۔ آگے بڑھنے کے لئے قرآنِ کریم نے یہ بات کہی ہے، جس کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا ہے کہ ہر شے کے راستے میں موانعات آتے ہیں، اور اُن کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جو شے موانعات سے ٹکراؤ میں غالب رہتی ہے، وہ زندہ رہتی ہے۔ جب راستے کے موانعات مغلوب کر دئے۔ جاتے ہیں، تو شے کی رفتار بہتر ہوتے ہوئے آگے تیزی سے بڑھتی ہے۔

اِس آیت کی وضاحت ہمیں ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اپنی تصنیف میں یوں فراہم کی ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی وضاحت:

وہ فرماتے ہیں کہ: خدا کے امر کی ممکنات کا ظہور رفتہ رفتہ اپنے کمال کو پہنچتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک بیج رفتہ رفتہ اپنی ممکنات کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کامل درخت بن جاتا ہے۔ گویا ارادہ اور امر کے بعد ایک تدبیر امر کا عمل

ہوتا ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ چیز کی ربوبیت کرتا ہے اور اسے تمام ارتقائی مدارج سے گزار کر اس کے کمال تک پہنچاتا ہے۔ اس عمل کے دوران میں اللہ کی تمام صفات جلال و جمال اپنا ظہور پاتی ہیں۔ اس تدبیر امر کے دو حصے ہوتے ہیں۔

ایک ہبوط اور دوسرا صعود، ہبوط سے مراد تخلیق کا وہ آغاز لیا جاتا ہے جو اس کی پست حالت سے ہوتا ہے، جو گویا اس کی ارض ہے اور ''صعود'' تخلیق کی تربیت اور تدبیر ہے جو اس کے معیار کمال کے تصور کے ذریعہ سے ہوتی ہے، جو اس کے ارتقاء کا بلند ترین نقطہ یا اس کا سماء ہے۔ ''یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ'' کے معنی یہی ہیں۔ اِس میں معیار کمال کا احساس گویا مبداء تدبیر و تخلیق ہے اور یہ ارتقائی حرکت مخلوق کو پستی سے بلندی کی طرف لاتی ہے۔ یہاں تک کہ مخلوق حسن و کمال کے اُس مقام بلند کو پالیتی ہے جو خالق کے ذہن یا ارادے میں بوقت تخلیق پوشیدہ ہوتا ہے۔ آیت کے آگے یَعْرُجُ اِلَیْہِ سے یہی مراد ہے۔ یہ مراحل ایک طویل مدت چاہتے ہیں لہٰذا، ''فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ'' سے یہی مراد اور معنی ہیں۔ اس آیت میں ''اَلْفَ سَنَۃٍ'' کے الفاظ کسی ریاضیاتی عدد کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ ایک محاورہ کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں، اور ان سے مراد ایک نہایت ہی طویل مدت ہے، یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ قرآن اس مدت کی طوالت کا ذکر کرتے ہوئے اسے ایک ہزار سال کی بجائے پچاس ہزار سال بتایا ہے۔

عالمِ امر کے نظریاتی طور پر نظریہ ارتقاء کا قانون کے متعین کرنے کی عمومی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اِس نظریاتی عمومی قانون کے اِنسانی زندگی کی تخلیق پر عملی اِطلاق کی صورت میں دیکھتے ہیں کہ حیاتِ اِنسانی مرحلہ وار ارتقاء کی منازل طے کرتے دکھائی دے رہی ہے۔

انسانی زندگی کی مرحلہ وار ارتقائی تخلیق کے سلسلہ کا قرآن میں بیان:

ارتقائی منازل میں سائنس کے انکشافات نے یہ چیز بتائی ہے کہ جب زندگی مختلف مراحل طے کرتی ہوئی، آگے بڑھی ہے، تو یہ سائنسدان تحقیق کرتے ہوئے، اسے بن مانس تک لے آئے اس کے بعد ان کی تحقیق کے مطابق پھر، انسانی پیکر آتا ہے۔ اب تک ان کی تحقیق یہ ہے کہ درمیان میں ایک گمشدہ کڑی ہے یعنی ارتقاء کی ایک کڑی ایسی ہے، جو ابھی تک سامنے نہیں آسکی۔ اس کے متعلق جاننے کے لئے مفکرین بڑی کاوش اور تحقیق کر رہے ہیں، لیکن اس گمشدہ کڑی کا ابھی تک سراغ حاصل نہیں کر سکے۔ قرآن کریم نے اِس کڑی کو نگاہوں سے اوجھل ہونے کی نسبت سے ''جنّ'' یا ''الجآن'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کہ

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰہُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (15:27)

انسان سے قبل الجآن نامی مخلوق کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا''۔

اس مخلوق کو الجآن کا نام دیا گیا ہے اور وہ اِنسانی عِلم سے ابھی تک اجنبی اور گمشدہ ہے اور اُس کا کائنات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اِسی لئے اُس کے جاننے کے سراغ میں تیزی دکھائی نہیں دیتی۔

حیاتِ انسانی کی تخلیق کے ارتقائی مرحلہ پر قرآن کریم ہی میں وضاحت کی گئی ہے کہ

بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (32:7)

''انسان کی پیدائش کی ابتداء طین سے ہوئی''۔

یہ چمکنے والی ایک بھربھری سی، ریتلی سی، مٹی ہوتی ہے، وہ بھی ایسی جو ایک دوسرے کے ساتھ چپک جائے۔ قرآن نے اِس کی وضاحت کی کہ:

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ (11:37)

''ہم نے پیدائش کی ابتداء چپک جانے والی مٹی سے کی''۔

دوسرے مقام پر غیر جاندار مادہ سے زندگی کی نمود کی ابتداء پانی سے کرنے کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا کہ

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ (21:30)

''ہر زندہ شے کی نمود پانی سے ہوئی ہے''۔

پانی اور مٹی ملتی ہے، تو طین لازب بنتی ہے۔ مٹی میں زندگی نہیں ہوتی، البتہ کچھ غیر جاندار نمکیات و معدنیات ہوتی ہیں۔ طین کہنے سے مراد اس کے نمکیات و معدنیات ہیں۔ آگے طین لازب چپکتی مٹی آ گئی۔ یہ سائنس کی تحقیق کے مطابق وہ ہے جو سمندر کے کنارے پانی کے مٹی کے ساتھ ملنے سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ جب پانی سے ملی مٹی کے اندر نمکیات اور معدنیات پر سورج کی روشنی و حرارات پڑی تو مٹی میں خمیر اُٹھنے سے پھر وہ چکنی مٹی بنتی ہے، جسے طینِ لازب چیچی مٹی کہتے ہیں، اس مٹی میں سے پہلا جرثومہء حیات ابھرا۔ یہ جرثومہء حیات ننگی آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا، اس کو خوردبین سے دیکھنا پڑتا ہے۔ نظریہ ارتقاء یعنی زندگی کا ابھرنا یہاں سے شروع ہوا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ (55:14)

یہ مٹی کا وہ مرحلہ ہے، جس میں مٹی پانی سے مل کر پھر سورج کی حرارت سے خشک ہو کر، پکائی ہوئی جیسی ہو جاتی ہے، اور وہ مٹی کھنکنے لگتی ہے۔

قرآن کریم نے اسی پکی ہوئی مٹی کے لئے لفظ فخار استعمال کیا ہے۔ فخار سے پہلے ''ک'' ہے، کَالْفَخَّارِ یعنی بالکل پکی ہوئی نہیں بلکہ اس کی مانند۔ قرآن نے طین کہا، پانی کہا، اس سے طین لازب بنایا، حرارت ملنے پر یہ مٹی فخار ہوئی۔ یہ ہے اس وقت تک کی تحقیق جو آپ کے ہاں ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ پھر مٹی کا پتلا بنایا گیا۔

اگر قرآن نے مٹی بھی کہا ہے، تو دوسرے مقام پہ کہا کہ

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾ (23:12)

''ہم نے انسان کی تخلیق کی ابتداء، بے جان مٹی کے خلاصہ سے کی''۔

مٹی کے خلاصے کو سمجھنے کے لئے ایک بیج مٹی میں دبایئے۔ سب سے پہلے بیج کی جڑیں زمین میں پھیلیں گی، اور پھر چند دنوں میں، بیج کی کونپل زمین سے باہر آجائے گی۔ کونپل اور پھر بعد میں درخت بننے پر آپ دیکھیں گے کہ اس میں مٹی کہیں نہیں ہے۔ بیج کی نشوونما مٹی کے نمکیات ومعدنیات یعنی مٹی کے خلاصے سے ہوئی۔ بیج کی جڑیں، پانی کے ذریعے نمکیات ومعدنیات یعنی مٹی کے خلاصے کو جذب کر کے، کونپل اور پھر پورے درخت میں پہنچاتی ہیں، جس سے پودے کی نشوونما ہوتی ہے۔

وَاللّٰهُ اَنۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ (71:17)

''اور اللہ نے تمہیں زمین سے سبزہ کے طور پر اُگایا۔''

یعنی زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔ سلسلہ ارتقاء کے ماہرین جب مختلف انواع حیات کو سمجھاتے ہیں تو وہ اسے درخت کی شکل میں ہی پیش کرتے ہیں۔ قرآن انسانی تخلیق کی اِبتدا کی وضاحت کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ

یہ ہے سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ''مٹی کا خلاصہ''۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے، زمین کے خلاصے سے، سب سے پہلے نفس واحدہ کی تخلیق کی۔ سائنس کے انکشاف کے مطابق یہ پہلا لائف سیل نر اور مادہ کا مجموعہ تھا۔ اسے قرآن کریم نے نفس واحدہ کہا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر ہم نے اس کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ سائنسدانوں کے نظریہء ارتقاء کے مطابق زندگی کی نمود جہاں سے ہوئی وہ زندگی کا پہلا جرثومۂ حیات تھا۔ یہ جرثومہ حیات بغیر طاقت ور مائیکروسکوپ کے دیکھا نہیں جا سکتا۔ یہ جرثومہء حیات ہر وقت متحرک رہتا ہے۔

سائنس کے انکشافات پر آپ حیران ہوں گے کہ رحم مادر میں، زندگی کا جو جرثومہ قرار پکڑتا ہے، وہ وہی اوّلین جرثومہء حیات ہوتا ہے، جو مٹی اور پانی کے امتزاج سے پیدا ہوا تھا، اور جس نے اربوں سال کے ارتقائی مراحل طے کر کے پیکر اختیار کیا، اور پھر جنسی اختلاط تک پہنچا۔ اب انسان کی رفاقت سے، یا دیگر جانداروں کی رفاقت سے، زندگی کا جرثومہ رحم مادر میں، اربوں سالوں کے وہ تمام مراحل صرف چند ماہ میں طے کر کے پیکر اختیار کر لیتا ہے۔ یہ جو رحم مادر کے اندر جرثومہ حیات ہے، اس نے بغیر حیوانی رفاقت کے، یعنی ارتقاء میں جتنے مراحل طے کیے، یہ جس جس شکل میں جو کچھ بنتا رہا ہے، آپ حیران ہوں گے کہ یہ اسی طرح سے رحم مادر کے اندر چند ماہ کے عرصے میں تمام کو عبور کرتا ہوا، اس شکل یا پیکر میں آجاتا ہے، جس میں یہ باہر آتا ہے۔ یہ جرثومہ، رحم مادر میں، ان تمام مراحل سے گزرتا ہے، جو اس نے اس سے پیشتر از خود کروڑوں اربوں سالوں میں طے کیے تھے۔ اس جرثومے کے اندر جتنی نشوونما ہوتی ہے، اب تو یہ بڑی آسانی سے تصاویر لے کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو وہی سارے مراحل ہیں، جو اربوں، کروڑوں سالوں میں طے ہوئے تھے۔ رحم مادر میں انسان کی رفاقت یعنی اس کے اعمال صالح جرثومہء حیات کو تیزی کے ساتھ بلندیوں کی طرح لے جاتے ہیں، اور چند مہینوں میں کروڑوں اربوں سال کا لمبا سفر طے ہو جاتا ہے۔ جب خدا کا امر بغیر رفاقت کے اپنی رفتار سے آگے بڑھتا ہے، تو اسے ایک طویل سفر اور عرصہ طے کرنا پڑتا

ہے، لیکن جب خدا کے امر کو انسان کی رفاقت نصیب ہوتی ہے، تو خدا کا امر چند مہینوں میں یہ سفر طے کر لیتا ہے۔

اب جنسی اختلاط کے بغیر زندگی کی کوئی شاخ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جنسی اختلاط سے ولادت کے لئے، خدا کا قانون یہ ہے کہ جب تک مرد و عورت یا نر و مادہ کا اختلاط نہیں ہوگا، بچہ پیدا نہیں ہوگا۔ نر و مادہ کا اختلاط ضروری ہے۔ ٹھیک ہے خدا اپنی قدرت سے، کائنات کو عدم سے وجود میں لایا (2:117)، لیکن جب وہ زندگی کو نر و مادہ کے اختلاط تک لے آیا، تو اب خدا بھی نر و مادہ کے بغیر اپنی قدرت سے بچے کی ولادت نہیں کرتا۔ اس نے کہہ دیا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس کی بیوی نہیں ہے یعنی اب بیٹا یا بیٹی کا پیدا ہونا مرد و عورت یا نر اور مادہ کے اختلاط پر منحصر ہوگا۔ خدا بھی اب یہ نہیں کرتا کہ اختلاط کے بغیر ولادت کے عمل کو مکمل کر دے۔ اب نسل کے آگے بڑھنے کا اصول یہ ہے کہ:

ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا (35:11)

''ازواج کے اختلاط کے نتیجے میں، نطفے کے ذریعے سے ہی ایسا ہوگا''۔

مزید یہ کہ:

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ (35:11)

''رحم مادر میں جنین، کن کن مرحلوں سے گزرتا ہے، اس کے اندر کیا کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں، پھر اس کے بعد کس طرح وضع حمل ہوتا ہے، یہ سب کچھ ہمارے علم میں آج ہے''۔

جو کام طبیعی قوانین کے تحت ہوتا ہے، اس کا علم خدا کو ہوتا ہے، لیکن جب انسان طبیعی قوانین کا علم حاصل کر لیتا ہے، تو پھر وہ علم، انسان کو بھی حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ اس نے تمام اسماء کا علم حاصل کرنے کی صلاحیّت انسان کو دے دی ہے (2:31)۔ جب تک انسان طبیعی قوانین کا علم حاصل نہ کر لے، وہ کام صرف خدا کے علم میں ہوتا ہے، اور جب انسان کا طبیعی قوانین سے متعلق علم بلند ہو جائے تو جو کام خدا کے علم میں ہوتا ہے وہ انسان کے علم میں بھی آ جاتا۔

اللہ کے نظریہِ ارتقاء میں کائنات کی ایک کڑی سے دوسری کڑی میں سونپے جانے کا اصول:

حیاتِ انسانی کے ارتقائی مراحل کے ایک کڑی سے دوسری کڑی میں سونپے جانے کے مراحل کی وضاحت میں سورۃ الانعام میں یوں کی گئی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (6:98)

خدا وہی ہے، جس نے تم کو نفس واحدہ (اوّلین جرثومہء حیات) سے پیدا کیا۔ پھر ہر زندگی کے لئے ایک مستقر (عارضی ٹھہرنے کی جگہ) ٹھہرائی، اور پھر اگلے مرحلے میں سونپے جانے کے لئے ایک مستودع ٹھہرایا۔ ہم نے اپنے قوانین کو نکھار کر بیان کر دیا ہے، اُن کے لئے جو سمجھ اور سوچ سے کام لیتے ہیں۔

قرآن دو الفاظ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ کی اصطلاحات میں ارتقاء کی تمام کڑیاں بیان کر گیا۔ مستقر کے معنی ہیں

''کسی متحرک شے کا چلتے چلتے کسی نقطہ پر آ کر رک جانا''۔ مستقر سے ہی قرار لفظ ہے۔ اور قرار کہتے ہی اس چیز کو ہیں کہ جس میں پہلے حرکت ہو اور پھر وہ رک جائے۔ جس میں حرکت نہ ہو اس کے لئے یہ لفظ آتا ہی نہیں ہے۔ متحرک شے دراصل ایک منزل میں سونپے جانے والی منزل مستدوع کی امانت ہوتی ہے۔ جب شے کو اگلی منزل کو سونپ دیا جائے، تو اس سونپے جانے کو شے کا مستودع کہتے ہیں۔

نظریۂ ارتقاء کی بنیاد، اس حقیقت پر ہے کہ زندگی جامد شے نہیں ہے، متحرک ہے اور یہ کہ زندگی کا ارتقائی سفر صعودی ہوتا ہے یعنی جس طرح ہوائی جہاز زمین سے مطلوبہ بلندی پر پہنچنے کے لئے پرواز کرتا ہے۔ زندگی اپنے اوّلین جرثومۂ حیات، قرآن کی زبان میں نفس واحدہ سے حرکت کرتی ہوئی، آگے بڑھی ہے۔ لیکن اس نے مسلسل حرکت نہیں کی۔ یہ ایک منزل میں آ کر، ایک وقت کے لئے نتیجہ خیزی کے لئے رکتی رہی ہے۔ یہ رکنے والا مقام طبیعی زندگی کا مستقر کہلاتا ہے۔ ٹھہرنے سے قبل، از خود جاری و ساری طبیعی قوانین کے مطابق ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ زندگی کو، طبیعی قوانین کے مطابق، طبیعی زندگیوں پر مبنی سامان زیست (توانائی) کو اپنے اندر جذب کر کے اگلے مرحلہ میں جانا ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ پہلے والے سے بہتر اور بلند ہوتا ہے، جس میں مطلوبہ قوّت مدافعت و محافظت اگلے مرحلہ (مستودع) کے موانعات کو مغلوب کرنے کے لئے پہنچائی جا سکے۔ اگلے مرحلے کے لئے مطلوبہ قوّتِ مدافعت و محافظت بہم پہچانے کو قرآن کی زبان میں زندگی کا اپنے اعمال صالح کا پلڑا جھکانا کہتے ہیں۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ (101:6-8)

جس کے (اعمالِ صالح) کے وزن کا پلڑہ بھاری ہوگا، اُس کی زندگی اُس کی حسین آرزوں کے مطابق خوش آئند ہوگی اور جس کا ہلکا ہوگا، وہ ذِلت کی پستیوں میں گر جائے گا۔

خدا کا قانونِ طبیعی انتخاب اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ شے نے مطلوبہ مقدار میں قوّت مدافعت و محافظت یا اپنے اعمال صالح کا پلڑا جھکا لیا ہے جو اگلی منزل کی موانعات کو ہٹانے کے کام آ سکے۔ ایسی صورت میں موجودہ منزل یا مستقر اس شے کو اگلی مگر بہتر اور بلند منزل مستدوع کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ مستودع پھر سے ایک خاص وقت کے لئے اس زندگی کا مستقر بن جاتا ہے اور اس مستقر میں زندگی اگلے مرحلے میں جانے کی تیاری کرتی ہے۔ پھر اپنے مستقر میں شے کو دوبارہ طبیعی سامان و زیست استعمال کر کے اگلے مستودع کے لئے مطلوبہ قوّت مدافعت و محافظت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ یہاں بھی خدا کا قانون طبیعی انتخاب فیصلہ کرتا ہے کہ شے کو اگلے مرحلے میں سونپا جائے یا مطلوبہ قوّت بہم نہ پہنچانے کی وجہ سے اس کو اسی مستقر کی منزل میں روک لیا جائے۔ ایسی رُک جانے والی زندگیاں اپنے اپنے جہنّم میں ہوتی ہیں۔ جہنم/جہیم کے معنی ہی ایک جگہ رُک جانا اور آگے نہ بڑھنا ہے۔

محققین کے مطابق سب سے پہلے ایک جرثومۂ حیات پیدا ہوا، جسے قرآن ''نفس واحدہ'' کہتا ہے۔ اُس نفس واحدہ

میں الگ الگ نر و مادہ بننے کی دونوں خصوصیات تھیں۔ نظریہء ارتقاء کی رو سے کائنات میں پائی جانے والی زندگیوں کے پیکر، ارتقائی منازل طے کرتے کرتے، موجودہ پیکروں تک پہنچے۔ سائنس بتا نہیں سکی کہ زندگی کا پہلا جرثومہء حیات کس طرح وجود میں آیا۔ زندگی کا پہلا جرثومہء حیات، طاقت ور خوردبین کے سوا نظر نہیں آسکتا تھا۔ یہاں سے زندگی ارتقائی منازل طے کرتی کیڑے مکوڑے، رینگنے والے، دو پاؤں پہ چلنے والے، چار پاؤں پہ چلنے والے، یہ گوریلا قسم کے چمپنزی وغیرہ بنے اور آخر میں انسان اپنی موجودہ شکل و شباہت میں آیا۔ نظریہء ارتقاء کی رو سے، زندگیاں ایک مرحلے میں ٹھہر کر، زمین کی طبیعی معدنیات و نمکیات کو بذریعہ پانی اپنے اندر جذب کرتی رہیں۔ جتنے عرصہ زندگی کی شاخ، اس مرحلے میں ٹھہرتی، وہ اپنے اندر، مرحلے کی مطلوبہ قوّت مدافعت و محافظت سے زیادہ اپنے اندر پیدا کر لیتی۔ جس مرحلے میں زندگی زمین کے معدنیات و نمکیات اپنے اندر جذب کرتی، وہ زندگی کی شاخوں کا مستقر کہلاتا۔ اگر زندگی اگلے مرحلہ کے موانعات اور رکاوٹوں کو مغلوب کرنے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کر لیتی تو وہ قانون ارتقاء کی رو سے اگلے مرحلے میں چلی جاتی یا سونپ دی جاتیں۔ اگلے مرحلے میں ترقی پانے والی زندگیاں، جب دوسرے مرحلے میں داخل ہوتیں تو وہ ان کا مستودع بن جاتا۔ زندگی کا پہلا مستقر تو وہ تھا جہاں سے زندگیاں ترقی پا کر اگلے مرحلے میں آئی ہیں، اور مستودع وہ ہے جہاں یہ آئی ہیں۔ یوں زندگیاں اپنے مستقر سے مستودع میں آتی رہیں۔ مستودع، مستقر بنتا رہا۔ قرآن کہتا ہے

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (7:24)

''اب تم نے یہاں ایک خاص مدّت تک زمین پہ رہنا ہے، اور یہاں کے متاع سے فائدہ اٹھانا ہے''۔

متاع کہتے ہیں مسافر کے مختصر سامان کو جو دوران سفر کام آسکے۔ لہٰذا بتا دیا کہ زمین پر تم مسافر ہو، تم نے آگے بھی جانا ہے۔ آج سائنسدان بھی بتا رہے ہیں کہ ایک دن اس کائنات نے نیست و نابود ہو جانا ہے۔ مستقر ٹھہرنے کا آخری مقام نہیں ہوتا۔ قرآن کی رو سے یہ ارضی زندگی، زندگی کا آخری مقام نہیں ہے، زمین تو ٹھہرنے کا عارضی مقام ہے، تاکہ انسان اس مرحلے میں اپنی ذات کی نشوونما کر لے۔ قرآن دو الفاظ 'مُستَقَرّ' 'وَّمُستَوْدَع' کی اصطلاحات میں ارتقاء کی تمام کڑیاں بیان کر گیا۔ اِسی سلسلہ میں قرآن مشیتِ اِلٰہی کا محو و ثبات کا بنیادی قانون بھی ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اگر زندگی نے مزید آگے بڑھنے کے لئے اپنے اندر وہ طبیعی قوت مدافعت و محافظت مہیا نہیں کی ہے، جو اگلے مرحلہ یعنی مستودع کے موانعات کو مغلوب کر سکے، تو وہ زندگی اپنے ہی مستقر کی نوع بن کر رہ جاتی ہے۔ اگر زندگی نے اگلے مرحلے یعنی مستوع میں جانے اور آگے بڑھنے کے لئے طبیعی قوت مدافعت و محافظت اگلے مرحلہ کے موانعات کو مغلوب کرنے کی حاصل کر لی ہے، تو زندگی اگلے مرحلے یعنی مستودع کے سپرد ہو جاتی ہے۔

قرآن کا گوشہِ امر میں اِرتقائی منازل تک رسائی کے حصول کے لئے ایک بنیادی اصول:

قرآن اِرتقائی منازل تک رسائی کے حصول کے لئے ایک اصولی قانون متعارف کرا رہا ہے کہ

يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ (13:39)

''اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اُس اُم الکتاب میں محفوظ ہے۔''

اِس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ جو شے، (قوم یا نظریہء زندگی یا نظامِ حیات) قانون خداوندی کی میزانِ مشیتِ میں باقی رہنے کے قابل نہ رہے، تو وہ مٹ جاتا ہے، اور جو اپنے آپ کو قانون خداوندی کی میزانِ مشیتِ میں، محکم واستوار ثابت کردے، وہ باقی رہتا ہے اور یہ محو وثبات ان اصولوں اور قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جو تخلیق کائنات کے ساتھ ہی اللہ نے عالم امر میں مقرر کردیئے تھے۔

اُمُّ الْکِتٰب میں اُمُّ کے معنی ہیں ''اصل و بنیاد''۔ تو عِنْدَہٗٓ اُمُّ الْکِتٰب کے معنی ہوں گے ''قوانین کی اصل ہمارے پاس ہے''۔ قوانین کس شکل میں یہاں کارفرما ہوتے ہیں، یہ تو ہم دیکھ سکتے ہیں، لیکن قانون کی اصل خدا کے پاس ہے، اور قرآن کا اصل قانون یہ ہے کہ حق ثابت رہتا ہے، باطل مٹ جاتا ہے۔ انسان جب قانون بناتے ہیں تو اس کی ایک اصل ہوتی ہے، جسے دیکھ کر کاپی کی تصدیق کی جاسکتی ہے کہ واقعی یہ کاپی اصل کے مطابق ہے۔ لیکن خدا کے قانون کی اصل عالم امر میں ہے، جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ خدا نے آخری ضابطۂ قانون رسول اللہ پر نازل کیا اور پھر اس کو قرآن میں محفوظ رکھنے کا ذمہ بھی خود اٹھالیا۔ اب کوئی بات خدا کے قانون یعنی قرآن کے مطابق ہے یا نہیں ہم قرآن سے اس کی تصدیق یا تردید کرسکتے ہیں۔ سابقہ انبیائے کرام کو دیئے ہوئے ضابطہء قانون کی حفاظت کا ذمہ خدا نے نہیں لیا تھا۔ ان قوانین کی اصل تو خدا کے ہاں ضرور ہوتی تھی، لیکن حفاظت کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد کسی بات کی مستند تصدیق یا تردید نہیں کی جاسکتی تھی کہ فلاں بات خدا کے قانون کے مطابق ہے یا نہیں ہے۔

قرآن نے خود ہی مٹانے اور باقی رکھنے کی اللہ کی مشیت کے اصول کی وضاحت بھی کردی ہے کہ:

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ط (42:24)

''اللہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے قانون کے مطابق قائم رکھتا ہے۔''

اِس بات کی مزید زوردار انداز میں یہاں کے علاوہ دوسرے مقام پہ تصدیق بھی کردی کہ:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ط (21:18)

ہم باطل کے سر پر حق کی ضرب لگاتے چلے جاتے ہیں، تا آنکہ حق، باطل کا بھیجا توڑ دیتا ہے۔

نسلی مسلمان اپنے آپ کو حق پہ سمجھ کر ساری دنیا کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ باطل پہ ہیں، وہ مغلوب ہوجائیں گے، اور ساتھ ہی اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ حق و باطل کی کشمکش میں غلبہ انہی کو حاصل ہوگا۔ خود فریبی پر مبنی اس قسم کا اطمینان انسان کو دین الحق میں نہیں، مذہب ہی میں حاصل ہوتا ہے، کیونکہ مذہب ہے ہی جذبات کا نام۔ دین میں تو حق کے معنی ہیں ''حقیقت کا محسوس اور ٹھوس شکل میں سامنے آجانا''۔ حق کوئی نظری یا ذہنی بات نہیں ہے کہ کسی کو نہ نظر آئے اور نہ ہی محسوس ہو، اور پھر بھی آپ، اپنے آپ کو حق پہ سمجھ کر خود فریبی میں مبتلا ہوجائیں۔ قرآن کریم کا ایک کلیہ ہے کہ حق اور باطل کی کشمکش کا

سلسلہ اس کائنات میں طبیعی قوانین کی رو سے ازخود جاری ہے۔ یہ کلیہ آج سے 1400 قبل قرآن نے بیان کیا جو آج کے معرکۃ الارا نظریۂ ارتقاء کی بنیاد بنا۔

قرآن کی سورہ اخلاص کو ہمارے ہاں اللہ کی ذات کے بارے میں دئے گئے مؤقف کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ہم بھی اب اللہ کی ذات کی بحث کو سمیٹتے ہوئے آخر میں اِسے سامنے لا رہے ہیں۔

قرآن میں اللہ کی بنیادی صِفتِ توحید کا ذکر:

قرآن کی سورہ اخلاص میں اللہ کی ذات کی بنیادی صِفات کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝٣ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝٤ (112:1-4)

رسول تو اعلان کر دے کہ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا، اور نہ وہ کسی سے جنا۔ اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی ہے۔

اس سورت میں ذاتِ خداوندی کی چار اساسی بنیادی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ انسانی ذات بھی چونکہ حدِ بشریت خدا کی صفات سے قُرب کے حصول کو اپنی ذات میں منعکس کرنے کی استعداد رکھتی ہے، لہٰذا اِنسان بھی اگر خدا کی صفات کو حدِ بشریت اپنے اندر منعکس کرتا ہوا قُرب حاصل کرتا جائے، تو وہ اللہ کے رنگ میں رنگتا چلا جائے گا۔

1۔ اللہ کی ذات کی پہلی صفت احد:۔ احدیت، ایک بڑی جامع اصطلاح ہے، جس کا ترجمہ ایک لفظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں تفرید (Uniqueness)، توحید (One-ness) اور وحدت و جامعیّت (wholeness) کے تمام رشتے آجاتے ہیں۔ اس صفتِ تفرید میں کسی اور شے کی آمیزش کا شائبہ نہیں ہوتا۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں:

گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

یہی اللہ کی ذات کی بنیادی مُطلق توحید کی خصوصیت بتائی جاتی ہے۔

2۔ اللہ کی ذات کی دوسری صفت صمد: یہ بھی ایک جامع لفظ ہے، جس کا مفہوم ہے خارجی سہاروں سے مستغنی ہونا، اپنے ارادوں کا مالک آپ ہونا، اپنے فیصلوں میں خودمختار ہونا۔

بشریت کی حد تک اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بھی بنیادی خصوصیت ہے، جس کے تحت کئے گئے اعمال اُسی کے تخلیقی اعمال کہلاتے ہیں، جن کا وہ جوابدہ ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس نہ مجبوری کی نیکی، نیکی ہے اور نہ مجبوری کی بدی، بدی ہے۔ واضح رہے کہ ذات کا اپنی مرضی سے اپنے اوپر پابندی عائد کر لینا، اس کی آزادی کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ تو ذات کے اختیار و ارادہ کا مظہر ہے۔ آزادی کے منافی وہ پابندی ہے، جسے کوئی دوسرا اس کی مرضی کے خلاف عائد کرے۔ اپنے اوپر پابندیاں خود ذاتِ خداوندی نے بھی عائد کر رکھی ہیں۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ (6:54) ”تمہارے رب نے رحمت (اور ربوبیت) کو اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے۔“

ساتھ ہی اپنے وعدہ کی یہ وضاحت بھی کر دی کہ:

كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا (25:16)

بے شک تمہارے رب کے وعدہ پر پوچھا جا سکتا ہے۔

یعنی وہ بھی اپنے وعدہ کا جوابدہ ہے۔ اِس سے وعدہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

انسان بھی اپنی ذات کی نشوونما کے لیے، جو پابندیاں بطیبِ خاطر خود اپنے اوپر عائد کرتا ہے، وہ اس کی مجبوری کا اِظہار نہیں کرتی اور شرفِ انسانیت کے منافی نہیں کہلائی جا سکتیں۔

3۔ اللہ کی ذات کی تیسری صفت لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ یہ بھی اللہ کی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ انسانی جسم بسلسلہ تولید (Procreation) پیدا ہوتا ہے۔ یہ ''پیدائش'' کی حیوانی سطح ہے۔ اس سے ایک فرد اپنے باپ کی اولاد بنتا ہے، اور پھر اس کی اولاد پیدا ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ذات، پیدائش کے اس سلسلہ کا نتیجہ نہیں۔ پیدائشِ بسلسلہ توالد و تناسل میں مرد کا ایک حصہ اس سے الگ ہو کر بیٹے کے جسم کا جزو بنتا ہے۔ لیکن ذات ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے۔ اگر ذات کا کوئی حصہ اس سے الگ ہو جائے تو ذات نامکمل رہ جاتی ہے، اور ذات کا نامکمل ہونا ذات کی بنیادی خصوصیت کے خلاف ہے۔

4۔ اللہ کی ذات کی چوتھی صفت کفو: اِس کا مطلب ہے کہ اللہ کی ذات کا کوئی جوڑ/ ہمسر نہیں۔ قرآن کریم نے ایسی ہی بشریت کی حالت میں اِس صِفت کی حامل جماعتِ مومنین کے متعلق فرمایا ہے کہ:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3:139)

''اور سُست نہ ہو، اور نہ غم کرو، اور تم ہی غالب (اعلیٰ) رہو گے، اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

اقبال کے مخصوص الفاظ میں:

مومنے، بالائے ہر بالاترے غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ مومنین یعنی وہ لوگ، جن کی ذات کی نشونما ہو رہی ہو، ان کا کوئی ہم پلہ اور ہمسر نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کی رفاقت میں سبھی سے ''اعلون'' ہوتے ہیں۔

اللہ کا اِدراک جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ عقل سے نہیں کیا جاتا، جو درحقیت نام ہے ان مجموعی نتائج کا جو انسان اپنے محدود ذرائع علم و مشاہدات سے حاصل کرتا ہے۔ سو جب وہ ذرائع محدود ہیں تو ان ذرائع کا ماحصل بھی محدود ہی ہوگا۔ اللہ اپنی ذات میں لامحدود ہے اور محدود، لامحدود کا ادراک نہیں کر سکتا۔ وہ انسان جو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کر سکا کہ وہ خود کیا ہے، وہ کیا معلوم کر سکے گا کہ خدا کیا ہے۔

ہم اگلے باب میں نظریہِ ارتقاء کی روشنی میں کائنات کے وجود میں آنے کے بعد اِس کے بتدریج اِنسانی طبیعی زندگی تک کے ارتقاء کا جائزہ لے رہے ہیں۔

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لغات القرآن

ن س خ

نَسْخٌ کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹا دینا اور اس کی جگہ دوسری چیز کو لے آنا۔ دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا (ابنِ فارس)۔ نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ۔ آفتاب نے سایہ کو ہٹا دیا اور اس کی جگہ روشنی لے آیا۔ یا کسی چیز میں تبدیلی کر دینا۔ نَسَخَتِ الرِّیْحُ آثَارَ الدِّیَارِ۔ ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات و علامات) کو تبدیل کر دیا۔ (یعنی وہ کھنڈرات وغیرہ جن سے آبادی کا پتہ نشان ملتا تھا انہیں ریت سے ڈھانک کر دگرگوں کر دیا)۔ نَسَخَ الْکِتَابَ۔ ایک کتاب کو نقل کر کے اس جیسی دوسری کتاب مرتب کر لینا۔ اسی سے اَلنُّسْخَۃُ۔ منقول (Copied) کتاب کو کہتے ہیں *۔ قرآنِ کریم میں ہے اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ (45:29) ''ہم لکھوا لیتے تھے''۔ مٹا دینے یا زائل کر دینے کے معنوں میں یہ لفظ (22:52) میں آیا ہے۔ فَیَنْسَخُ اللّٰہُ۔ ''اللہ مٹا دیتا ہے''۔

لہٰذا نَسْخٌ کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لے آنا۔ اس لفظ کی اہمیت اس لئے ہے کہ ہمارے ہاں ناسخ و منسوخ کا عقیدہ چلا آ رہا ہے۔ اور اسے دین کے مہمات میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے بھی بہت اہم۔ اس لئے کہ اس کا غلط مفہوم دین کو اس کی جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے۔ اور اس کا صحیح مفہوم قرآن کو خدا کے دین کا آخری اور واحد ضابطہ ثابت کر دیتا ہے۔

ناسخ و منسوخ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں متعدد آیات ایسی ہیں (بعض کے نزدیک ان کی تعداد پانچ سو تک ہے)۔ جو پڑھی تو جاتی ہیں لیکن جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ پھر سن لیجئے کہ (اس عقیدہ کے مطابق) قرآنِ کریم میں پانچ سو کے قریب ایسی آیات ہیں جنہیں محض ''ثواب'' کی غرض سے پڑھ لیا جاتا ہے لیکن ان میں جو احکام ہیں وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں۔ بعض احکام قرآنِ کریم کی دوسری آیات نے منسوخ کر دئے ہیں اور بعض احکام احادیث نے منسوخ کر دئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآنِ کریم کے اندر موجود نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ (مثلاً آیہ رجم۔ یعنی زانی کو سنگسار کرنے کے حکم والی آیت)۔ اس عقیدہ کی رو سے قرآنِ کریم کی شکل یوں بنتی ہے کہ:۔

قرآنِ کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے احکام تو منسوخ ہو چکے ہیں لیکن جن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے۔ اور

ایسی آیات بھی ہیں جو قرآنِ کریم کے اندر تو نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ دوسری قسم کی آیات کے لئے تو دلیل صرف روایات کی ہے۔ لیکن پہلی قسم کی آیات

کے لئے خود قرآنِ کریم ہی کی ایک آیت سے دلیل لائی جاتی ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (2:106)۔

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

ہم جس آیت کو بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآنِ کریم میں کسی بات کا حکم دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ اس نئی آیت میں یہ کہیں نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔ اس لئے قرآنِ کریم میں منسوخ آیات بھی اسی طرح سے موجود ہیں اور ناسخ آیات بھی۔ اللہ نے ان کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ فلاں آیت منسوخ ہے فلاں آیت سے۔ یہ تعین بعد میں روایات کی رو سے یا مفسرین کے اپنے خیالات کی رو سے کیا گیا۔ چنانچہ ان آیات کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ حتی کہ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک ان کی تعداد صرف پانچ ہے۔

باقی رہا ''فراموش کرا دینے'' کا سوال۔ سو اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوتی تھیں لیکن رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ) انہیں بھول جاتے تھے۔ تو پھر انہی جیسی آیات اور نازل ہو جاتی تھیں۔ یہ مراد ہے اَوْ نُنْسِهَا سے اس کی دلیل میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ؕ (87:6-7) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا۔ ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے۔

اس عقیدہ کی رو سے آپ دیکھئے کہ خدا، قرآنِ کریم اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ خدا کا تصور اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لئے وہ قرآنِ کریم کے اس حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے۔

قرآنِ کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے۔ اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی ناسخ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی اس کی ناسخ۔

اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ تصور کہ حضور ﷺ خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے۔ یا للعجب!

ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم آگے آئے گا۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ن۔س۔ی دیکھئے جہاں اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔

اب دیکھئے اس آیت (مَا نَنْسَخْ.....) کا صحیح مفہوم۔ پیچھے سے سلسلہ کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآنِ کریم اور رسالت محمد ﷺ پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں (قرآنِ کریم ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے)۔ اسی سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا

(اور یہ اعتراض بڑا اہم تھا) کہ جب خدا نے انبیاء سابقین (مثلاً حضرت موسیٰؑ وغیرہ) پر اپنے احکام نازل کر دئے تھے' اور وہ احکام توریت وغیرہ میں موجود ہیں۔ تو پھر ان کی موجودگی میں اس نئے رسول اور نئی کتاب کی ضرورت کیا تھی؟ اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی طرف سے سلسلہ رشد و ہدایت حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو وحی بھیجی جاتی تھی ان میں ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہوتا تھا جو وقتی ہوتے تھے اور ان کا تعلق خاص اسی قوم سے ہوتا تھا جس کی طرف وہ احکام بھیجے جاتے تھے۔ اور انہیں انہی حالات میں نافذ العمل رہنا ہوتا تھا جو اس زمانے کے تقاضے سے پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں' جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضوں سے وہ حالات بدل جاتے تو ایک اور رسول آ جاتا اور وہ ان احکام کی جگہ دوسرے احکام لے آتا۔ اس طرح یہ جدید وحی اس سابقہ وحی کی قائمقام (ناسخ) بن جاتی۔ یہ سلسلہ شروع ہی سے ایسا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ توریت کے کتنے احکام ہیں جنہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آ کر بدل دیا (یہ بدلے ہوئے احکام انجیل میں موجود ہیں)۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کے تقاضے اور اس کی ذہنی سطح بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے ہر قوم کو اس کے حالات اور ارتقائی سطح کے مطابق ہی احکام دئے جاتے تھے۔ ان کی سطح سے بلند احکام وقوانین روک لئے جاتے تھے۔ تا آنکہ ان کے بعد دوسری قوم آتی جو ارتقائی منزل میں ان سے آگے ہوتی۔ تو وہ ''روکے ہوئے'' احکام وقوانین اس وقت نازل کر دئے جاتے۔ تنزیل وحی میں یہ اصول بھی کارفرما رہا ہے۔

نیز یہ شکل بھی ہوتی کہ ایک رسول کے چلے جانے کے بعد' اس کی قوم اس کی وحی کے بعض حصوں کو ترک کر دیتی۔ بعض کو فراموش کر دیتی۔ اس لئے ان ترک کردہ یا فراموش کردہ حصوں کو (جن میں کسی تغیر وتبدل کی ضرورت نہ ہوتی) بعد میں آنے والے رسول کی وحی سے از سر نو تازہ کر دیا جاتا۔

یہود سے کہا گیا کہ وحی کا سلسلہ اس طرح چلا آ رہا ہے۔ اب وہ دور آ گیا ہے جس میں انسانی شعور پختگی حاصل کر لے گا۔ لہٰذا اب انتظام یہ کیا گیا ہے کہ۔

(1) سابق انبیاء کی وحی کے وہ تمام احکام جو ان کی قوم کے حالات اور ان کے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ مخصوص تھے منسوخ کر کے ان کی جگہ' دوسرے احکام وقوانین بھیج دئے جائیں۔ اور چونکہ وحی کا یہ سلسلہ اب ختم ہو رہا ہے اس لئے یہ احکام وقتی اور ہنگامی نہیں ہوں گے بلکہ ابدی طور پر انسانیت کا ساتھ دینے والے ہوں گے۔ اس لئے یہ احکام وقوانین سابقہ احکام سے بہتر ہوں گے۔

(2) وہ قوانین جنہیں پہلے روک لیا گیا تھا کیونکہ ہنوز انسانیت اس سطح پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ انہیں سمجھ سکے یا اپنا سکے' اب انہیں بھی نازل کر دیا جاتا ہے' کیونکہ قرآنِ کریم انسانیت کی بلند ترین سطح تک اس کا ساتھ دے گا۔

(3) اور سابق انبیاء کی وحی کے وہ احکام وقوانین جنہیں ان کی قوموں نے ترک کر دیا تھا۔ یا فراموش کر دیا تھا (یا جن میں انہوں نے تحریف کر دی تھی) ان کی تجدید کر دی گئی ہے۔ (ان کی مثل احکام دے دئے گئے ہیں)۔

یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے ایک نئے رسول اور نئی

کتاب کو بھیجا گیا ہے۔ اور یہ ہے وہ وجہ کہ اب تمام سابقہ کتابوں کی جگہ اسی قرآنِ کریم پر ایمان لانا اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اب اس کے سوا ہدایت کی کوئی اور راہ نہیں۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ (2:137)۔ اگر یہ بھی اسی طریق پر ایمان لائیں جس طرح (اے جماعت مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ ہدایت پا سکیں گے۔ اور اگر اس راہ سے اعراض برتیں گے تو پھر خدا کے راستے کے مخالف سمت جائیں گے۔

یہ ہے صحیح مفہوم مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ کا۔ اب دیکھئے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کس طرح اس مفہوم کے آئینہ دار بنتے ہیں۔

نَسَخَ کے معنی ہم نے اوپر دیکھ ہی لئے ہیں۔ کسی چیز کی جگہ کسی دوسری چیز کو لے آنا۔ آیَتٌ کے معنی صرف قرآنِ کریم کی آیات نہیں۔ قرآنِ کریم نے ہر رسول کی وحی کو آیَاتُ اللّٰہِ کہا ہے۔ مثلاً اسی سورہ بقرہ میں قصۂ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38)۔ جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کرے گا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ اور اس سے آگے ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ ... (2:39) ان کے برعکس، جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کریں گے اور ان سے انکار کریں گے..... یہاں سے ظاہر ہے کہ جہاں اور جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی ہے اسے آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ میں آیات سے مراد قرآنِ کریم کی آیات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کسی سابق وحی کی آیات کی تبدیلی بعد کی وحی کی آیات سے۔ جیسا کہ سورہ نحل میں کہا گیا ہے۔ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ (16:101)۔ ''اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں''۔

اس کے بعد لفظ نُنْسِهَا ہے۔ یہ لفظ نَسِیَ سے ہے۔ نَسِیَ کے معنی کسی چیز کو ترک کر دینا' یا فراموش کر دینا' آتے ہیں۔ (دیکھئے عنوان ن۔س۔ی)۔ اس لفظ میں یہ ساری حقیقت آجاتی ہے کہ سابقہ کتب آسمانی اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہتی تھیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے کہ جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کی وحی میں سرکش اور مفسد لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا دیا۔ لیکن خدا کی طرف سے ایسا ہوتا رہا کہ ان کی اس آمیزش اور ملاوٹ کو الگ کر دیا جاتا اور اس طرح اللہ اپنی آیات کو از سر نو محکم کر دیتا (22:52)۔ یا وہ اس وحی کے کچھ حصے کو ترک ہی کر دیتے تھے۔ اس حصہ کو خدا نئے رسول کی وحی میں پھر شامل کر دیتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت (یا اس کی مثل اس جیسی آیت) سے مراد سابق وحی کی آیات ہیں نہ کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت کی جگہ دوسری آیت۔

نَسِیَ کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہ چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ اس اعتبار سے آیت نُنْسِهَا سے مفہوم یہ ہوگا کہ جن سابقہ احکام کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہوتا کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے' انہیں ہم نئے رسول کی وحی میں اسی طرح شامل کر دیتے۔

اس اعتبار سے قرآنِ کریم ایک طرف تمام انبیاء سابقہ کی وحی کا مُهَيْمِنٌ ہے (5:48)۔ یعنی اس کے اندر وہ تمام قوانین محفوظ ہو گئے ہیں۔ اور دوسری طرف خدا کو جس قدر احکام نوع انسانی کے لئے دینے تھے' ان سب کی تکمیل ہو گئی ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ (6:115)۔

اور اب اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115)۔ نہ خدا کی طرف سے اب کسی تبدیلی کی ضرورت باقی ہے اور نہ انسانوں میں سے کوئی اس میں رد و بدل کر سکے گا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (15:9)۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے وحی کے سلسلہ کو اس طرح کیوں رکھا۔ تو اس کا جواب یہ کہہ کر دے دیا کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (2:106)۔ خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ انسانوں کو کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہئیں اور وہ دور کب آئے گا جب انہیں مکمل ضابطہ حیات دے دیا جائے۔ یہ سب کچھ ان اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر اسے پوری پوری مقدرت حاصل ہے۔

یہ ہے ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ اس کا ہر حکم اپنی جگہ محکم و غیر متبدل ہے۔ البتہ ہر حکم خاص حالات کے ماتحت نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ جب حالات بدل جائیں تو اس کی جگہ قرآن کا دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ کے لئے وضو کرنے کا حکم ہے۔ لیکن اگر پانی نہ ملے یا انسان مریض ہو تو وضو کی جگہ تیمم کا حکم ہے (5:6)۔ ان حالات میں وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا اور تیمم کا حکم آگے آ جائے گا۔ جب پانی مل جائے گا (یا مرض جاتا رہے گا) تو پھر وضو کا حکم آگے آ جائے گا اور تیمم کا حکم پیچھے چلا جائے گا۔

یا مثلاً قرآنِ کریم نے چور اور زانی (وغیرہ) کے لئے سزا مقرر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں چوری اور زنا کی وارداتیں نہ ہوں تو قرآنِ کریم کے (سزاؤں کے متعلق) احکام نافذ العمل ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کسی معاشرہ میں مفلس، محتاج، گداگر نہ رہیں تو خیرات وغیرہ سے متعلق احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو وراثت کے احکام اس پر نافذ نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے جس میں فالتو دولت یا جائداد کسی کے پاس نہ ہو تو وراثت کے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کو ''ناسخ و منسوخ'' سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ احکام اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ جب وہ حالات پھر پیدا ہو جائیں جن کے ماتحت انہیں نافذ ہونا تھا، تو وہ پھر نافذ ہو جاتے ہیں۔ ''منسوخ'' اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہو سکے۔ قرآنِ کریم میں ایسا کوئی حکم نہیں۔

مَا نَنْسَخْ والی آیت (2:106)۔ یا سورہ النحل کی آیت اِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ (15:101) میں اگر آیہ سے مراد کائناتی حوادث و وقائع لئے جائیں (جنہیں قرآنِ کریم متعدد مقامات پر ''آیات اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے) تو ''نسخ آیت'' سے مراد ہوگا نظام کائنات کے کسی ایک طریق یا مظہر کی جگہ کسی دوسرے طریق یا مظہر کا آ جانا۔ اربابِ علم و تحقیق سے پوشیدہ نہیں کہ کائنات میں اس قسم کے تبدلات کس طرح آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن چونکہ ہر دو مذکورہ بالا آیات کے سیاق و سباق کا تعلق وحی سے ہے اس لئے ہم پہلے بیان کردہ مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ دوسرے مفہوم کی رو سے معانی میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

اول الذکر مفہوم ہو یا ثانی الذکر، یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ قرآنِ کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو منسوخ ہو۔ اس غیر متبدل صحیفہ آسمانی کا ایک ایک حرف اپنے مقام پر اٹل ہے اور اٹل رہے گا۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

نجمہ بہت ذہین بچی تھی۔ جو بات ایک بار سن لیتی وہ جیسے ہمیشہ کے لیے اسے یاد ہوجاتی۔ جس سے ایک بار مل لیتی، اس کا چہرہ اور نام کبھی نہ بھولتی۔ پڑھنے میں بھی وہ بہت تیز تھی۔ اپنی کلاس میں ہمیشہ اوّل آتی۔ اسے اپنی کتابوں کے اکثر سبق اور نظمیں زبانی یاد ہوگئی تھیں۔ نجمہ کو اپنے حافظہ پر بڑا غرور ہوگیا۔ اس نے محنت سے اپنی کتابیں پڑھنی چھوڑ دیں۔ ہر وقت قصہ کہانی کی کتابیں اور رسالے پڑھتی رہتی۔

آخر امتحان سر پر آ گیا۔ اب نجمہ تھی اور کورس کی ڈھیر ساری کتابیں۔ تاریخ، جغرافیہ، انگریزی، اردو، حساب، جنرل سائنس وغیرہ۔ نجمہ نے سب کتابیں یاد کرنے کی کوشش کی مگر آٹھویں جماعت کا کورس اتنا آسان تو ہوتا نہیں کہ دس بارہ دن میں پڑھ کر کوئی پاس ہوجائے۔

امتحان ہوا۔ نجمہ کے پرچے اچھے نہ ہوئے۔ چند دن کے بعد نتیجہ نکل آیا اور ہمیشہ اوّل آنے والی نجمہ فیل ہوگئی۔ تمام خاندان کو بہت حیرانی ہوئی کہ آخر یہ کیسے ہوگیا؟ مگر ہونے والی بات تو ہوچکی تھی۔

نجمہ بہت اداس اداس رہنے لگی۔ وہ اپنے کمرے سے بھی باہر نہ نکلتی۔ آخر اس کی امی اور ابّو نے اسے بہت سمجھایا:

''غم نہ کرو۔ صبر کرو۔ انشاء اللہ اگلے سال پاس ہوجاؤ گی۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

نجمہ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آخر صبر کرنے سے کوئی پاس کیسے ہوسکتا ہے؟ صبر کرنے سے دوسرے کام کیسے ہوسکتے ہیں؟ نجمہ کے ذہن میں بہت پریشانی پیدا ہوگئی۔ ایسی پریشانی جو ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔

ایک دن نجمہ کے ماموں کراچی سے لاہور آئے۔ نجمہ کو اپنے ماموں سے بہت پیار تھا۔ وہ بہت خوش ہوئی اور اس خوشی میں اپنے فیل ہونے کا غم بھول گئی۔ ماموں نے نجمہ کو لاہور کی خوب سیر کروائی۔ جہانگیر کا مقبرہ، بادشاہی مسجد، شالامار باغ، باغ جناح، چڑیا گھر، مینارِ پاکستان، جلو پارک، ریس کورس پارک، گلشنِ اقبال پارک، قائداعظم لائبریری اور بھی کئی جگہوں پر خوب گھومے پھرے۔ جب اتوار آیا تو انہوں نے صبح ہی صبح نجمہ سے کہا:

''بیٹی آٹھ بجے تک تیار ہوجانا۔ آج ہم درسِ قرآن سننے چلیں گے۔ قرآن مجید، اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اس کتاب کی اچھی اچھی اور پیاری پیاری باتیں سمجھ کر اور ان پر عمل کر کے ہم بڑی ترقی کر سکتے ہیں۔ یہی ہماری بڑائی کا واحد راستہ ہے۔ آج مسلمان دنیا کی دوسری قوموں سے کتنا پیچھے رہ گئے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ اب وہ قرآن مجید سے اپنی

زندگی کے لئے روشنی حاصل نہیں کرتے۔''

نجمہ اندر جا کر عورتوں اور اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ جو صاحب درس قرآن دیتے ہیں۔ اُنہیں یہ سب لوگ ''باباجی'' کہتے ہیں۔ دس بجے درس قرآن شروع ہوا۔ باباجی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر اپنی تقریر شروع کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی نجمہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ باباجی تو ''صبر'' کے بارے ہی میں تقریر کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ قرآن مجید کی روشنی میں صبر کسے کہتے ہیں۔

باباجی نے بتایا:

''عربی زبان میں صبر کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنا کام مکمل کرنے کے لئے بھرپور محنت کرتا رہے۔ لگاتار کوشش اور اپنے مقصد پر مضبوطی سے ڈٹ جانے کو صبر کہتے ہیں۔ اسی لیے پہاڑ کو ''الصبیر'' کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے جما کھڑا رہتا ہے۔''

نجمہ بہت پڑھی لکھی تو نہ تھی کہ باباجی کی تمام باتیں اس کی سمجھ میں آجاتیں مگر اس نے بڑے غور سے تقریر سنی۔ صبر کے سچے اور اصلی معنی اس کی سمجھ میں آ گئے۔

باباجی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی مثال دے کر بتایا کہ وہ تھے سچے صبر والے جو اللہ کے راستے پر ڈٹ کر آگے بڑھتے رہے۔ مشکلیں آئیں، مخالفین نے جنگیں کیں مگر نہ تو ان لوگوں میں کمزوری آئی اور نہ ان کے قدم سست پڑے۔

جب تقریر ختم ہوئی تو جیسے نجمہ کے ذہن کی الجھن دور ہوگئی اور یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

گھر واپس جاتے ہوئے نجمہ نے اپنے ماموں سے کہا:

''ماموں جی! اب میں بہت محنت سے پڑھوں گی۔ یہی تو صبر ہے مگر زیادہ تر لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جب کسی آدمی کے غلط کاموں کا بُرا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے تو اس سے کہتے ہیں صبر کرو۔ آخر ایسے صبر سے کیا ہو سکتا ہے۔ توبہ توبہ''۔

ماموں کہنے لگے:

''بیٹی! مسلمان کی تباہی کی وجہ یہی تو ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ تو باقی رہ گئے ہیں مگر ان کے معنی بدل گئے ہیں۔ میری بیٹی! تم محنت سے پڑھو اور قرآن مجید کو اپنا ساتھی بنا لو۔ یوں تمہاری زندگی بھی سنور جائے گی اور تمہارے آس پاس والوں کی بھی۔''

قارئین طلوعِ اسلام توجہ فرمائیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی درجِ ذیل سالانہ خوبصورت جلدیں 800 روپے فی جلد کے حساب سے دستیاب ہیں۔ اپنے کتب خانوں میں ''طلوعِ اسلام'' کے فائلز مکمل کرنے کے لئے آرڈر فرمائیے۔ شکریہ

1972، 1975، 1976، 1977، 1983، 1984، 1985، 1986، 1987، 1988، 1991، 1999، 2000، 2001، 2002، 2003، 2004، 2005، 2006، 2011، 2015، 2016، 2017، 2018۔

Tolu-e-Islam Seminar

held on Sunday 29th November 2020

A seminar was organised via Zoom on 29th November 2020 from 18.00 to 21.00 hours Pakistan Standard Time. This seminar was initiated at the proposal of Prof. Dr Saleha Naghmi of Lahore Bazm, who had suggested that since an annual convention could not be held this year due to the Covid19 pandemic, hence, there was a need to have a mini convention in order to continue the good tradition of Tolu-e-Islam. Dr Ejaz Rasool, Representative of UK Bazm, suggested holding a seminar using the Zoom platform whereby speakers may give a talk on a topic of their own interest related to Quranic values. As a consequence, relevant instructions and guidelines were issued in advance. In response, the following four speakers agreed to give a presentation:

1. Ms Nabila Haris (Karachi) – Parenting – a guide
2. Mr. Mumtaz Khan (Canada) – Mutashabihaat (Metaphors) according to the Quran
3. Mr. Muhammad Iqbal (Karachi) – Man-made system versus the Divine system
4. Dr Hamid Mian (New York) – Manifestation of a developed human self

The Chairman of Idara Tolu-e-Islam addressed the seminar and emphasised the need for the system of Rabubiyat to solve the problems of humanity. Tolu-e-Islam as a movement aims to aid understanding of the Quran rationally, through the intellect and reasoning as per the writings of Allama Parwez. The Chairman briefly outlined some initiatives which the Idara is taking to promote the message of the Quran and the work done by Allama Parwez in this regard. A new web site, www.tolueislam.org, has been launched in this respect to provide information across the world on the work produced by Allama Parwez on the Quran for

the benefit of mankind.

Ms Nabila Haris outlined some of the issues involved in effective parenting in light of some of the Permanent Values of the Quran. Presently, this task of bringing up children is not accorded sufficient gravity by most parents as there is no provision of education or training for the parents in this immensely important work. The talk covered a number of important aspects of parenting and human psychology which can assist with some of the issues of bringing up children in a conducive family environment.

Mr Mumtaz gave a talk on the topic of metaphors as per verse (3:7) in the Quran. As the world continues to advance in all kinds of fields, these metaphors will increasingly reveal their significance and will become realities. He stated that the words of Allah are supported by the work of Allah; the Quran can never become outdated.

Mr Iqbal provided a comparison of man-made systems and the Divine system (Deen). He quoted many verses to demonstrate the glaring chasm between the two systems, and concluded that humanity will not be able to draw the benefits of this worldly life optimally without the system of Deen. The man-made system is inherently exploitative and does not allow mankind to develop its potentials which then leads to all kinds of problems which we are witness to in the world of today.

Dr Hamid Mian shared his understanding about the issue of human self development and the need to bring change in the world through collective effort. He quoted from the works of Allama Iqbal to explain various aspects which the human self needs to follow to achieve a higher understanding of the purpose of its life. In life one needs a higher purpose, then the desire to pursue it, and followed by the requisite effort to achieve it, this then leads to acquiring an ever higher understanding by that very self.

The seminar was attended by forty four members across the world (from USA, Canada, Italy, UK, Kuwait, and various cities in Pakistan). There was much positive feedback from the attendees. The recordings and presentations of the talks have been shared on the forum (WhatsApp) where they are available to access.

Surah Al-Najm (النجم)
Durus-al-Qur'an: Chapter 2

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

From only this point of view I am saying their Prophet and our Prophet. Otherwise, to me all the Prophets (PBUH) all equally respectable. Anyway, it is clear that all these narrations are against the Quran and therefore fake; and have been the result of conspiracy by Jews. These narrations cannot be from the Prophet (PBUH). Christians did similar things: that Jesus (PBUH) was born without father; that he is alive in the heavens – so he is superior to Muslims' Prophet (PBUH) who was born like a common man and died like a common man. And here we are who accept all these fake narrations because these have been narrated in our hadith books. These things about Moses (PBUH) and Jesus (PBUH) are not only there in our narrations but have become our ideology and faith, which if and anyone rejects, is given fatwa that he has gone outside the fold of Islam. What deep conspiracies have been hatched with us my friends? May Allah protect us!

Hadith taught in our Islamic schools

My dear friends, not a single word of the Quran can be changed. Allah, the Almighty, Himself has taken the responsibility of protecting it. All the books of hadith were compiled more than two hundred years after the Prophet (PBUH) based on oral narrations from chain of narrators. There was no master copy and no printing machines those days. No one knows how these narrations came in these books. Anyway, for more than thousand years, these books which have all these narrations, are taught in Islamic schools. The ideology about these hadith books is that these books coexist with the Quran and are like the Quran; that anyone who rejects even a single hadith of Bukhari or Muslim exits from the fold of Islam. The belief is that just like the Quran these hadith books are based on revelation from Allah; that there are two kinds of revelations – one that is recited which is in the Quran and the other that is not recited and is

in the hadith books; that if there is a contradiction between hadith and the Quran about a certain verse then the interpretation should be stretched somehow to fit the hadith with the Quran; and if that is not possible then that Quranic verse is considered abrogated. According to this traditional creed we can see what position the Kaaba and Prophet (PBUH) have compared with Bani-Israel's center of Bait-al Muqaddas (بیت المقدس) in Jerusalem and Moses (PBUH).

Our fabricated hadith has complicated the legal status of Bait-al Muqaddas

The issue regarding Bait-al Muqaddas that who should be its custodian; or who should control it; or even who should own it – is a current political issue. If Jerusalem issue remained as it was during the Prophet's time when there was nothing there except rubbles because the Byzantines had demolished Solomon temple and destroyed the city – and if a mosque was built there, it was built on empty place – then Jewish claim is without any proof. If we accept the Jewish claim that there was Solomon temple and Muslims demolished to build their mosque in its place, then a court will decide in Jewish favor. Our hadith books say that there was Solomon temple where Prophet (PBUH) led prayer and now if a mosque is there in its place then Solomon temple must have been demolished to build the mosque, no matter it may have been built in 72 Hijrah by Abdul Malik during Umayyad rule. Thus these narrations provided the proof for the Jewish claim that there was Solomon temple and Muslims built their Mosque there.

Mr. Maududi's contradictory remarks in September 1969

My dear friends, let me repeat what I presented in the last lecture about contradicting statements of Mr. Maududi. He wrote in September 1969 that there was no Solomon temple in Jerusalem at the advent of Islam. This was correct. Therefore, Israeli claim does not stand any ground that Muslims demolished our temple and built their mosque there. But after some days in the same month and year he wrote that Bait-al Muqaddas in Jerusalem is the first Qiblah because the Prophet (PBUH) and his companions used to pray towards it; that being the first Qiblah this place of worship is always sacred to Muslims; that as long as our Prophet (PBUH) was in Makkah he prayed in such a way that Masjid al-Haram and Masjid Al-Aqsa were line up in the same direction. But this was not

possible in Medina because both this Masjids were in opposite direction. So, he acknowledges that Masjid Aqsa was there at the time of the Prophet (PBUH) and this is reported in all the hadith books; and if you do not believe it then you are purged from Islam. So, we are providing proof for Israel's claim because it is all there in our hadith books. Now, it is worth pondering how these narrations got into our hadith books. There is nothing in the Quran about making Bait-al Muqaddas as first Qiblah. So, the question of changing Qiblah does not arise. Therefore, Kaaba was the Qiblah from the beginning. The Quran told the Prophet (PBUH): إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَ هُدًى لِّلْعَالَمِينَ (3:96) – The first House ever built for the entire humankind was Makkah. It was from this place that humanity was destined to get the guidance and the Divine Laws which would ensure stability and nourishment for all.

So, my dear friends, in light of the above, you can very well imagine what the true facts are, of what the narrations in different hadith books say about the first part of Mi'raj!

Second part of Mi'raj – meeting with Allah

Now, take the second phase of the journey. The Prophet (PBUH) went to meet Allah who was sitting on His throne above the seventh heaven. What kind of picture you get my friends from this – Allah, the Almighty, the Creator of heavens and earth, was sitting on a fixed throne to meet the Prophet (PBUH) at a certain time! This brings forth the concept of "space and time." But we know that space and time are related to only material things. This is taught to children in school. The Quran has mentioned again and again that Allah is beyond space and time. It is says: هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (57:3) – He is above and beyond time and space. He was the first; and He would be the last. For Him there is no beginning and there is no end. He overpowers everything but His power is invisible and works unperceptively. Law is always invisible and non-physical. However, its results can be perceived; and it may be said that His attributes of creation and Sustenance are the visible manifestations of His Being. His being is invisible to the human eyes. In this way one can say that He is Transcendent and Imminent. He has the knowledge of everything.

Every material thing comes into existence at some point in time and ends at some point in time. If it is present at some place it cannot be present at

another place at the same time. Wherever it is, it occupies space. Think about it my friends: that Allah being physically situated in space and time and the Prophet (PBUH) has to physically go there to meet Him? When these facts are brought out in front of those who perpetuate the Mi'raj story, their kneejerk response is that Allah has all the power to do anything. But this is not the question of power. It is the question of what kind of concept emerges of Allah from this story. This is completely against the concept of Allah as presented by the Quran. The Quran says: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ (2:186) – O Messenger! When My devotees ask you about Me, tell them that I am close to them at all times. So much close that: وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (50:16) – We are closer to him than his jugular vein. And: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (57:4) – He is with you wherever you may be. Consequently, Allah was with the Prophet (PBUH) all the time. So, Allah being situated in a particular place is completely a wrong concept of Allah. As Iqbal says:

O Preacher! You have made God sit on a physical throne!
What kind of God is He who is alienated from His devotees?

He is so far away from his servants, that He used special means to carry the Prophet (PBUH) to meet Him. But other human beings cannot! Therefore, how can the life of the Prophet (BUH) serve as a role model for humans if that is the case?

Leave aside others, even such a great Prophet as Musa (PBUH) who wanted to see God was told: لَّا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (6:103) – No human vision can encompass Him. Human vision can see only material things. But God is beyond material attributes.

Crooked arguments to justify going to heavens to meet Allah

My dear friends, all kinds of crooked arguments are presented to justify the story of Mi'raj beyond the familiar rhetoric that "Allah has power to do anything." When airplanes started flying then the proponents of status quo started saying: look if ordinary human beings can fly into the sky, then God, the possessor of infinite might, can't He make the Prophet (PBUH) reach the heaven using ladder. When astronauts travelled to the moon then these traditionalists started saying that if these astronauts can go to the moon then how come our Prophet (PBUH), with God's permission, cannot travel to the highest heaven. Allah has all the power

to do anything. Well, my friends, it is not the question of power but a question of what concept of God emerges from such stories. The concept that the Quran has given of God, such a concept cannot be found anywhere else.

My dear friends, Quran's concept of God is beyond any material attributes; it is beyond human thought and imagination. If you look at all the religions of the world there is something material involved in God's concept – either in the form of idols; or in the form of avatars; or as son of God; or God carrying a sword, surrounded by angels, descending from lightning clouds to earth, etc. Everywhere else you will find God in of some form of physical form. The Quran's concept of God is the only concept that is beyond any physical form; it is beyond human vision and thought. According to the Quran, He is everywhere wherever you may be; He is closer to you than your jugular vein; He is beyond human comprehension. There exists no physical attribute whatsoever associated with Him; He cannot be confined into space and time. The cooked argument that Allah can do anything because He has all the power is nothing more than whitewash and an escape mechanism from facing the realities of the Quran.

My dear friends, I felt it necessary to provide you the necessary backdrop before starting Surah Al-Najm, because this Surah along with the first verse of Surah 17 is presented in regards to the traditional view of what is labeled "Isra-wal-Mi'raj" – that the Prophet (PBUH) went from the Masjid in Makkah to the Masjid Aqsa in Jerusalem on Buraq; and from there to meet Allah to the seventh heaven who was sitting on His throne there. The Prophet (PBUH) received وحی (Wa'hi -Revelation) from Allah for 23 years; He was sending instructions and commands to the Prophet (PBUH) to establish His Deen. There is nothing in Surah Al-Najm about Prophet (PBUH) going anywhere, let alone going to Masjid Aqsa or visiting the heavens to meet Allah. When the Prophet (PBUH) was in constant touch with Allah then why would Allah ask him to come to the heavens to receive the gift of 50 prayers and to receive the last two verses of Surah Baqarah? The entire Quran was revealed to the Prophet (PBUH) by Allah. Why would Allah specially ask him to come to the heaven to receive the last two verses of Surah Baqarah?

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہوجائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گڈمڈ ہوجائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوجاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی رد و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کرسکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.74
ISSUE
1

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

عزیزانِ من! جسے انسان کی ضمیر کی آواز کہا جاتا ہے، وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کا معیار نہیں ہے۔ جس قسم کے معاشرے میں کوئی پرورش پائے گا، اسی قسم کی اس کی ضمیر ہوجائے گی۔ اور جب اس کے خلاف کوئی کام ہوگا، تو اس کی ضمیر اس کے خلاف اِبا کرے گی، اس کے خلاف نفرت کرے گی۔ یہ لوامہ ہوا۔ انسانی نفس کے اندر یہ بات ہے کہ وہ ملامت کرتا ہے۔

میں آگے چل کر بتاؤنگا کہ جب آہستہ آہستہ آپ اس ابا کرنے کی پروانہیں کرتے، اسے دباتے چلے جاتے ہیں، جذبات آپ پر غالب آتے چلے جاتے ہیں، پھر وہ ملامت بھی نہیں کرتا۔ وہ جرائم عام ہوجاتے ہیں۔ یہ جتنے جرائم پیشہ ہیں، پھر ان کا ضمیر ان کو ملامت نہیں کرتا، بلکہ وہ انہیں قابلِ ملامت ہی نہیں سمجھتا۔ وہ جن چیزوں کو قابلِ ملامت بھی سمجھتا ہے، وہ وہی ہوتی ہیں جو شروع سے اس کے ذہن میں ڈالی گئی ہیں کہ یہ غلط ہیں۔ اب یہ چیز سمجھ لیجیے کہ انسان کا ضمیر یا نفسِ لوامہ ان چیزوں پہ ملامت کرتا ہے جن کے متعلق پہلے سے اس کو بتایا گیا ہے کہ یہ بری ہیں۔ ٹھگوں کا بیٹا اس کی ایک مثال ہے۔ اسے بچپن سے تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک تم ایک شخص کو مار نہ دو گے اس وقت تک تمہاری شادی نہیں ہوسکتی، اور یہ بھی کہ یہ کالی دیوی کا حکم ہے۔ وہ مارتا ہے۔ وہ ایک شخص تو مارتا تھا۔ پتہ نہیں اب بھی مارتے ہیں یا نہیں۔ اب تو ساری دنیا ٹھگ ہوگئی ہے۔ الگ ٹھگوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ جس طرح اقبالؒ (1877-1938) نے ابلیس کی زبان سے لکھا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے درخواست دی کہ جی! مجھے اب ریٹائر کرکے چھٹی دیجیے، میں گھر بیٹھوں۔ کہنے لگے: کیوں؟ کہنے لگا: اب تو ہر شخص شیطان ہے، یہاں میری ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔

(پرویز۔ درسِ قرآن، سورۃ القیامہ، 9 مارچ 1984ء)